ماہنامہ

آنکھ مچولی

اولمپک اسپیشل

واہ رے طوطے واہ!

طوطوں کی جنّت کا حال

اندر ملاحظہ کیجیے

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں!
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams
TAPAL TEA
DANEDAR
ٹپال چائے
دانے دار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
MASS

مُدیرِ اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول

تجمّل حسین چشتی

مُشاورت

مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اعزازی

طاہر مسعود

محمد سلیم مُغل

مجلسِ اِدارت

شاہنواز فاروقی، سیّد خورشید عالم

خطاطی

عارف سعید

جلد	۳
شمارہ	۳
ستمبر	۱۹۸۸ء
محرم الحرام	۱۴۰۹ھ
قیمت	۶ روپے

زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

ماہنامہ

آنکھ مچولی میں

شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جُملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

گرین گائیڈ اکیڈمی

ادارہ اشاعت برائے

تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال

زیرِ سرپرستی

ضمیرُالدین میموریل آرگنائزیشن

ماہنامہ

آنکھ مچولی

میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ناشر

ظفر محمود شیخ

طابع ـ زاہد علی، مطبع ـ لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

گرین گائیڈ اکیڈمی

برائے خط وکتابت و مقامِ اشاعت ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ سائٹ، کراچی

۷	اداریہ	۵۷	جانوروں میں انسان کا رشتہ دار
۸	ڈاک ڈاک کس کی ڈاک	۶۳	ایک ننھی پری کی خواہش
۱۱	اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟	۶۵	عنکبوت وڈیوسینٹر
۱۲	کربلا تیرے شہیدوں کو سلام	۷۰	گنی چنی معلومات
۱۳	گرے پڑے لوگ	۷۳	وقت کی گاڑی
۱۸	کھلاڑی طوطے	۷۹	سائنس انکوائری
۲۱	سرخ گلاب	۸۴	عظمت کا راز
۲۷	وہ ایک تصویر	۸۹	دھماکہ
۳۰	ہو کے سے ہا کی تک	۹۶	سوال در سوال
۳۴	میں مزارِ قائدِ اعظم پہ جاؤں گا مگر	۱۰۲	بارش چھم چھم ہوتی ہے
۳۹	اولمپک یونان سے سول تک	۱۰۳	سفر آہستہ آہستہ
۴۵	خبرنامہ سول	۱۰۷	نئی تحریریں
۴۹	اولمپکیات	۱۱۷	آؤ ملائیں ہاتھ
۵۱	کھٹ مٹھے (منتخب لطائف)	۱۲۰	امی ابو کا صفحہ

میں جارہا ہوں مِرا انتظار مت کرنا

اگست کی سترھویں شب جب نجے ٹیلی وژن پر دلچسپی سے نیشنل جغرافِک کا پروگرام دیکھ رہے تھے کہ اچانک نشریات روک دی گیئں۔ آیاتِ قرآنی کی تلاوت ہونے لگی اور پھر یہ منحوس اطلاع دی گئی کہ صدر محمد ضیاء الحق اور ۲۹، دیگر افراد ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اِنا لِلہ وانا الیہ راجعون۔

صدر ضیاء الحق نیک، خدا ترس اور پابند صوم وصلوٰۃ سربراہ تھے۔ ان کی ناگہانی موت سے ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل سوگوار ہے۔ ان کے علاوہ افواجِ پاکستان کے قیمتی جرنیل کی ہلاکت بھی ایک ایسا ناقابلِ تلافی نقصان ہے جس سے پوری قوم دم بخود ہے۔ موت خدا کی مرضی ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ ہے کہ باقی رہنے والی ذات صرف خدا کی ہے۔ خدا کی دی ہوئی اس چند روزہ زندگی میں ہمیشگی وہی حاصل کرتے ہیں جو ذاتی حرص و ہوس سے بلند ہو کر انسانوں کی خدمت کریں۔

صدر ضیاء الحق کی سیاست سے ہمیں کوئی غرض نہیں کیونکہ یہ بڑوں کے طے کرنے کے معاملات ہیں۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی سادگی، انکسار اور خوش خلقی سے عبارت تھی۔ وہ انسان دوست تھے اور دشمن کا دل جیت لینا بھی جانتے تھے، انھیں بچوں سے پیار تھا اور معذور بچوں کے لیے ان کا دل ہمدردی اور محبت کے جذبات سے معمور تھا۔ وہ نیکی، سچائی اور اسلام کے آفاقی اصولوں کا پرچار کرتے تھے۔ وہ چھوٹوں سے چھوٹے بن کر ملتے تھے اور ان میں غرور، تکبر، انانیت، خود پسندی اور اس طرح کی دوسری خرابیاں نہیں تھیں۔ اپنی انھی خوبیوں کی بنا پر انھوں نے گیارہ برس تک حکومت کی، اور جب اپنی قوم سے جدا ہوئے تو ایک ایسی ناگہانی موت کے ذریعے جو بہرحال شہادت ہی کا درجہ رکھتی ہے۔

صدر ضیاء الحق اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن وہ اپنے بے شمار اوصاف کی بنا پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

نشانِ عظمت

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب سفر کے لیے ریل گاڑی اور جہاز وغیرہ موجود نہیں تھے۔ لوگ دُور دراز کا سفر اونٹوں اور گھوڑوں وغیرہ پر بیٹھ کر کرتے۔ ڈاکوؤں کے حملے کے خوف سے لوگ قافلے بنا کر چلتے۔ اس زمانے میں ایک قافلہ ایران کے شہر جیلان سے بغداد کے لیے سامانِ تجارت کے ساتھ روانہ ہُوا۔ قافلے میں ایک نوعمر لڑکا بھی شامل تھا۔ قافلہ ابھی کچھ ہی دُور پہنچا تھا کہ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اور لُوٹ مار کرنے لگے۔ ایک ڈاکو نوعمر لڑکے کے پاس آیا اور اُس سے پُوچھا "تمھارے پاس کیا ہے؟"

"چالیس دینار" لڑکے نے جواب دیا۔ ڈاکو لڑکے کی صاف گوئی پر حیران رہ گیا اور اُسے پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گیا۔ سردار نے لڑکے سے اُس کی صاف گوئی کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا: "میری والدہ نے چلتے وقت چالیس دینار میری صدری میں سی دیے تھے اور کہا تھا کہ میں ان کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤں، لیکن ساتھ ہی میری والدہ نے ہدایت کی تھی کہ میں ہرگز جھوٹ نہ بولوں، چنانچہ میں نے پوچھے جانے پر صاف صاف آپ لوگوں کو اپنے چالیس دیناروں کے بارے میں بتا دیا۔" سردار لڑکے کی سچائی سے بڑا متاثر ہُوا اور اُس نے قافلے والوں کا لُوٹا ہُوا تمام سامان واپس کر دیا۔ کیا آپ کو معلوم ہے یہ نوعمر صاف گو لڑکا کون تھا؟ یہ نوعمر لڑکا عبدالقادر تھا، جو بڑا ہو کر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کہلایا۔ جن کا مزار بغداد میں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسکول کھل گئے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں، پھر وہی پڑھائی لکھائی کا موسم آگیا۔ جب تک چھٹیاں تھیں، کتنی آزادی تھی، کتنی بے پروائی اور بے فکری تھی، نہ صبح سویرے اٹھنا تھا، نہ اسکول جانا تھا، نہ ہوم ورک کرنا تھا، ذہن ہر فکر و تردد سے آزاد تھا۔ لیکن اب اسکول کے گیٹ کھل چکے ہیں، کلاس روم آباد ہیں اور پڑھائی شروع ہو چکی ہے۔ اب احساسِ ذمے داری کا تقاضا ہے کہ آپ اپنی زندگی میں نظم و سلیقہ پیدا کیجیے اور اپنے وقت کا بہتر سے بہتر استعمال کیجیے۔ یوں بھی یہ مہینہ اس عظیم ہستی کی یاد منانے کا ہے۔ جس نے ہمیں آزادی دلائی اور جس نے اپنی زندگی کا کوئی بھی لمحہ رائگاں جانے نہیں دیا۔ اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم ... قائدِ اعظمؒ کا پیغام تھا۔ نوجوانوں کے لیے اس پیغام میں بہت سی باتیں سمجھنے کی ہیں۔

اتحاد ہر سطح پر چاہیے آپ اپنی جماعت میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے درمیان یا کھیل کی کسی ٹیم میں۔ اور اتحاد کی بنیاد ہوتی ہے۔ آپس کی محبت اور یگانگت، ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار کا جذبہ، اتحاد ہی میں قوت ہے، اتحاد ہی میں برکت ہے۔ قائدِ اعظم کے پیغام کا دوسرا نکتہ یقینِ محکم ہے۔ اس ملک کی سالمیت پر یقین، اس ملک سے آپ کی بے پناہ محبت کی روش، اس ملک کو اپنا مستقبل، اسے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بنانے کا ارادہ۔ یہی وہ جذبے ہیں جو آپ میں یقینِ محکم پیدا کریں گے۔ عظیم رہنما کے قول کا آخری نکتہ تنظیم ہے۔ تنظیم کے معنی صرف انجمن سازی نہیں ہے۔ تنظیم کا مطلب ہے نظم و ضبط، سلیقہ و ترتیب، ڈسپلن، کیونکہ کارزارِ حیات میں ان اوصاف کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ آپ کی ذاتی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک، آپ کے کمرے اور گھر سے لے کر اسکول اور کھیل کے میدان تک، آپ کے لباس اور رہن سہن کے طریقوں سے لے کر ملنے جلنے کے سلیقوں تک، آپ ایک اچھے طالب علم، ایک اچھے شہری اسی وقت بن سکتے ہیں جب آپ کی زندگی نظم و ضبط کی ڈور سے بندھی ہو۔ جس ملک کے طالب علموں میں، نوجوانوں میں یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں کوئی وجہ نہیں کہ وہ قوم ترقی کی شاہراہ کو روشن نہ کر سکے۔

یہ مہینہ دفاع کے اعتبار سے بھی ہمارے ملک کے لیے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ملک کا دفاع سرحدوں پر جا کر ہی کیا جائے۔ ہم یہ کام ہر اس جگہ پر رہ کر کر سکتے ہیں جہاں ہم موجود ہیں۔ ہمارا ملک نظریاتی ہے۔ اسلامی ہے۔ لہٰذا اس کی نظریاتی سرحدیں بھی ہیں اور ہم اس کی حفاظت اس طرح کر سکتے ہیں کہ سب سے پہلے تو اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق بسر کریں۔ قول و عمل کے تضاد سے بچیں اور ماحول میں ڈھل جانے کے بجائے اسے اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ یہی وہ طریقے ہیں جس سے ہم ان مقاصد کو پورا کر سکتے ہیں جن کے لیے یہ ملک قائم کیا گیا تھا۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

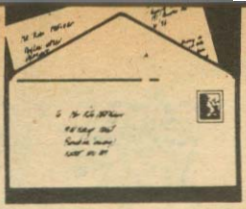

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

ساجد حسین، رتن تالاب، کراچی ۔ آپ نے لکھا ہے کہ بہترین لطیفے کا انتخاب قارئین پر چھوڑ دینا چاہیئے، اور یہ کہ ہمارے منتخب کردہ بہترین لطیفے پر آپ کو بالکل ہنسی نہیں آئی۔ فرض کیجیے ہم آپ کے مشورے پر عمل بھی کرلیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ سارے قارئین کسی ایک ہی لطیفے پر متفق ہوجائیں گے۔ بھئی ہر شخص کا ذوقِ مذاق مختلف ہوتا ہے اور لطیفے کا معاملہ تو یہ ہے کہ جس لطیفے پر ایک وقت ہنسی نہیں آتی، اس لطیفے پر کسی اور موقع اور ماحول میں ہنس ہنس کر بے حال ہوجانے کو جی چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کا فیصلہ تو آپ ادارے پر ہی چھوڑ دیں، اور ہاں آنکھ مچولی کا انداز بدل سکتا ہے لیکن اس کے معیار میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ مطمئن رہیئے۔

محمد باسط، شہر کا نام نہیں لکھا ۔ باسط میاں! کیا آپ نے نہیں سُنا کہ "اولڈ از گولڈ" پرانی چیزیں قیمتی ہوتی ہیں اس لیے مہنگی ہوتی ہیں۔ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے نایاب ہیں اس لیے ان کی قیمت بڑھ تو سکتی ہے گھٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو آنکھ مچولی کے مدیر کا فون نمبر کیوں درکار ہے؟ چپکے سے بتا دیجیے۔ کیا کسی کی شکایت کرنی ہے؟

پرنس وسیم بن اشرف، میاں چنوں ۔ آپ نے یہ خط بے دلی سے لکھا ہے لیکن ہم آپ کو جواب دل لگا کر لکھ رہے ہیں۔ جن تحریروں کو آپ نے پسند کیا ہے ان کے مصنفین تک آپ کی مبارک باد پہنچا دی جائے گی۔ رہی آپ کی تحریریں تو ابھی ان کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے انتظار کریجیے۔

نعیم طاہر، لاہور کینٹ ۔ آپ نے خوب لکھا ہے کہ آپ کی ردّی کی ٹوکری روزے نہیں رکھ سکتی؟ بھئی ہماری ردّی کی ٹوکری کی عمر اتنی کم ہے کہ ابھی اس پر روزے فرض نہیں ہوئے ہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ہم سالانہ خریداروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ آپ نے "مضمون "مکھی مار کر زندہ کرنا" بھیجا ہے اور دھمکی دی ہے کہ اگر اسے شائع نہ کیا گیا تو آپ کبھی اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ کسے؟ کیا مکھی کو؟

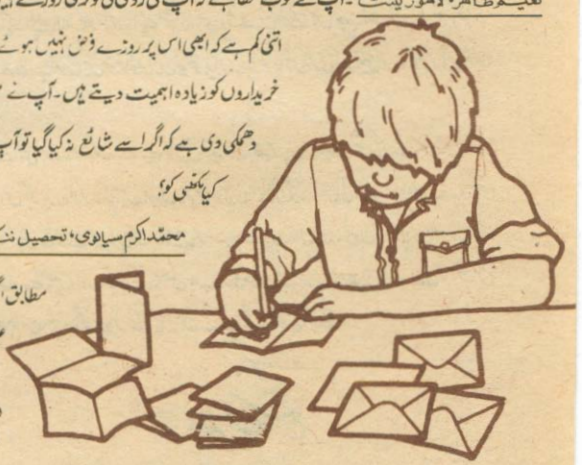

محمد اکرم سیالوی، تحصیل ننکانہ صاحب ۔ بھئی آپ کے مشورے کے مطابق اگر ہم اس بنیاد پر تحریریں شائع کرنے لگیں کہ کس علاقے میں پرچہ زیادہ فروخت ہوتا ہے پھر تو ساری تحریریں کراچی، لاہور، حیدرآباد اور ملتان والوں کی ہی چھپیں گی اور آپ پھر بھی گھاٹے ہی میں رہیں

تحریروں کا فیصلہ تو معیار پر ہی ہوتا ہے۔ نئے چراغ کے لیے تصویریں اور تعارف ابھی جمع ہو رہے ہیں، نئی تحریریں، میں بچے نقل شدہ تحریریں بھیج دیتے ہیں تو یہ قصور تو بچوں کا ہوا۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ کوئی تحریر نقل شدہ چھپنے نہ پائے۔ آپ اپنے دل سے ہمارے متعلق تمام وسوسے نکال دیں۔ کیونکہ وسوسہ کمزور دل میں پیدا ہوتا ہے۔

محمد فیصل شمشاد، ناظم آباد، کراچی ۔ بھیا! تحریر بھیجنے کے بعد تھوڑا سا انتظار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کی فرمائش اور فرمائش پر آپ کے خط کا جواب شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے آپ خوش ہو گئے ہوں گے۔

محمد حبیب القادر یزدانفر، ملتان ۔ آپ کا کاغذی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا ہم تک پہنچ گیا "تلاش" ناول آپ کو پسند نہیں آیا۔ یہ سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔ ٹکٹ جمع کرنے اور کرکٹ کے کھیل پر معلوماتی مضامین آنکھ مچولی کے پچھلے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے اپنا پورا نام شائع کرنے کی ہدایت کی ہے۔ آپ کے نام کے آخری حصے میں بڑی انفرادیت پائی جاتی ہے۔

ملک خلیق احمد ناز۔ کوٹ رادھا کرشن ۔ کہانی لکھنے کا طریقہ آپ نے دریافت کیا ہے۔ ایک مشہور مصنف سے بھی کسی نے یہ سوال کیا تھا کہ کہانی لکھنے کے لیے کیا چیزیں ضروری ہوتی ہیں؟ پتہ ہے اس نے کیا جواب دیا؟ اس نے کہا چند سادہ کاغذ اور ایک عدد قلم۔ آپ کہیں گے ضرور کوئی مزاحیہ مصنف ہوگا۔ بہرحال! آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس پر کوئی مضمون آپ جلد ہی پڑھ لیں گے۔

منیر احمد فاضل، لاهور ۔ آپ نے بہت ہی اچھی اچھی تجاویز ارسال کی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تمام ساتھی آنکھ مچولی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے اتنے ہی اچھے اچھے مشورے دیا کریں۔ آپ نے لکھا ہے کہ نئے شماروں میں انعامی مقابلے بالکل نہیں ہیں۔ حالانکہ ایسا تو نہیں ہے انعامی مقابلے تو اچھے خاصے ہیں۔ آپ کے مشورے نوٹ کر لیے گئے ہیں۔

بشیر احمد جیدی، ڈاکخانہ ساگری، ضلع راولپنڈی ۔ آپ کے ذہن میں ڈھیروں کہانیاں ہیں۔ بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن آپ ایک سطر چھوڑ کر کوئی طویل کہانی کیسے لکھیں؟ یہ ہے آپ کا مسئلہ۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کہانیاں لکھنے کے لیے پیڈ خرید لیا ہے۔ میرے عزیز! ایک سطر چھوڑ کر کہانی لکھنے سے ذرا زیادہ کاغذ کی ضرورت ہوگی لیکن اس میں ہمارے لیے سہولت یہ ہو جاتی ہے کہ ہم اگر کہانی میں کانٹ چھانٹ کرنا چاہیں تو یہ کام بآسانی ہو جاتا ہے۔

ریاض احمد، کوٹری ۔ آپ نے لکھا ہے کہ آنکھ مچولی میں اب پہلے جیسی رنگینیاں اور دلچسپی باقی نہیں رہی۔ حالانکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ رنگینیاں اور دلچسپیاں پہلے کے مقابلے میں بڑھ گئی ہیں۔ رنگین صفحات عام شماروں میں جتنے پہلے ہوتے تھے اتنے ہی اب بھی ہیں۔ پھر بھی ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی شکایت کو دور کر سکیں۔

آفتاب عزیز خٹک، شارع فیصل، کراچی ۔ "آنکھ مچولی کو جو ایک بار پڑھتا ہے اسی کا ہو جاتا ہے" جی ہاں یہی وجہ ہے کہ اب آپ نے بھی اسے اپنا لیا ہے۔ آپ کو تمام ساتھی آنکھ مچولی میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

نظیر سندھی، کندھکوٹ ۔ عزیزم! آپ کی طرح ہمیں بھی افسوس ہے کہ آپ کا خط کیوں شائع نہیں ہوا؟ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کے خط میں کوئی جواب طلب بات ہی نہ ہوگی۔ کتابیں منگوانے کے لیے۔ برائے مہربانی منی آرڈر بھیج دیجیے۔

نائلہ میرے پیرزادہ، ناظم آباد کراچی ۔ آنکھ مچولی میں عام طور پر گھریلو پکنک، سالگرہ یا کسی تقریب کی تصویریں شائع نہیں ہوتیں۔

بھائی کی تصویر آپ "آؤ سلائیں ہاتھ" میں چھپوا سکتی ہیں۔

صائمہ اسلم، تحصیل مری، ضلع راولپنڈی ۔ آپ کو ہر ماہ آنکھ مچولی خریدنے کے لیے پچاس کلو میٹر سفر کرنا پڑتا ہے، آنکھ مچولی کے لیے آپ کو اتنا لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ واقعی مطالعے کا شوق ہو تو ایسا۔ آپ آنکھ مچولی کی سالانہ خریدار بن جائیے۔ سالانہ چندہ آپ بذریعہ منی آرڈر بھجوا سکتی ہیں۔

اسد علی خان، سرگودھا ۔ ساتھیوں کو مسلم ممالک سے متعارف کرانے کے لیے ہم نے سفرنامے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ آپ کو کیوں پسند نہیں آیا۔ عام ساتھیوں نے تو اسے بہت سراہا ہے۔ بہرکیف پسند اپنی اپنی۔

پرنس مبشر علی زیدی، انچولی، کراچی ۔ آپ نے ہماری توجہ محمد عادل منہاج کے مضمون "آج کے طالب علم" کی طرف دلائی ہے، اور لکھا ہے کہ ایک ہی مضمون دو رسالے میں بھیجنے کی بیماری بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ہمیں اس کا سختی سے نوٹس لینا چاہیئے۔ ایک مضمون دو رسالوں میں چھپوانا بڑی بد دیانتی کی بات ہے اور ہم اپنے لکھنے والوں سے کبھی ایسی توقع نہیں رکھتے۔ آپ مطمئن رہیئے اس کا علاج سختی سے کیا جائے گا۔

نورالاسلام سحر، جیوانی مکران ۔ ہم تو پہلے ہی اچھے خاصے نمبر شائع کر چکے ہیں۔ اب آپ نے عید نمبر، سنچری نمبر، آزادی نمبر اور کرکٹ اسپیشل، کی فرمائش ایک ساتھ کر دی۔ میرے بھائی! نمبر نکالنے کی کوئی مشین تو ہوتی نہیں۔ ایک نمبر نکالنے میں جتنی محنت اور عرق ریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کی اتنی ڈھیر ساری فرمائشوں پر بالکل ناراض نہیں ہوئے۔ بلکہ آخر میں جو آپ نے کہانی نمبر کی فرمائش بھی اس انداز میں کی ہے کہ "اور ہاں... کک... کہانی نمبر بھی کشش... شائع کریں" پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آگئی۔

رفاد، شہر نامعلوم ۔ آپ کے ابا جان آپ کی پٹائی کرتے ہیں، وہ آپ کو پڑھنے بھی نہیں دیتے اور ابھی سے کام پر لگا دیا ہے۔ ہمیں آپ کا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ کبھی کبھی ایسے حالات زندگی میں پیش آجاتے ہیں۔ اس کا حوصلے کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔ گھر چھوڑ کر بھاگنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا، کیونکہ باہر کی دنیا میں آپ کے ساتھ اس سے زیادہ بُرے حالات پیش آئیں گے۔ آپ پہلے اپنے رویے اور عادتوں کا جائزہ لیجئے کہ کیا آپ کی ذات سے آپ کے والد کو کوئی شکایت تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو اُسے دُور کرنے کی کوشش کیجیے اور پھر اپنے فرائض کو ذمہ داری سے ادا کیجئے۔ والدین کا کہنا مانیے، ان کی خدمت کیجیے۔ اُنھیں خوش رکھنے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ مسلسل ایسا کرتے رہے تو ان کا رویّہ بھی آپ سے بہتر ہو جائے گا۔

محمد فاروق، منگھو پیر، کراچی ۔ آپ کا سسپنس سے بھرپور، پُراسرار جاسوسی ناول "ڈریکولا اور انمول انعام" کی تفصیل پڑھ کر ہمیں تو خوف سے جھرجھری آگئی۔ ناول پڑھے بغیر ہماری رائے ہے کہ اگر اسے آنکھ مچولی میں شائع کیا گیا تو ساتھی خوفزدہ ہو جائیں گے۔ اس لیے آپ اپنی مختصر کہانیاں ہمیں بھیج دیجیے۔ معیاری ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

جاوید احمد سندھی ہوٹل، کراچی ۔ آپ کا یہ شعر مفہوم کے اعتبار سے تو ٹھیک ہے کہ ؎

ہر رسالے کو آزما کر یہ فیصلہ کیا   آنکھ مچولی ہی میرے دل کے قریب ہے

لیکن چونکہ یہ شعر بے وزن ہے اس لیے اسے شعر نہیں کہا جا سکتا۔ بہتر ہے کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہو اُسے نثر ہی میں کہا کریں۔

شازیہ فرحین، ناظم آباد، کراچی ۔ جب کوئی تحریر چھپنے کے لیے منتخب کر لی جاتی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ فوراً ہی شائع ہو جائے۔ چھپنے میں بھی کچھ وقت لگ ہی جاتا ہے۔ اس لیے آپ سے انتظار فرمانے کی درخواست ہے۔

اسلامی مہینوں میں ترتیب کے اعتبار سے سب سے پہلا مہینہ محرّم ہے، عربی زبان میں محرّم کے معنی ہیں وہ چیز جس کو حرام کیا گیا ہو۔ عزت و حرمت والی چیز کو بھی محرّم کہہ دیا جاتا ہے۔

اسلام سے پہلے کفر و شرک کے زمانے میں بھی اس مہینے میں لڑائی کو حرام سمجھا جاتا تھا اور عرب جیسی جنگجو قوم بھی اس مہینے میں لڑائی سے پرہیز کرتی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے دُنیا میں تشریف لانے سے پہلے دسویں محرّم کا روزہ رکھا جاتا تھا آپؐ نے اس کے ساتھ ایک اور روزہ بھی رکھنے کا حکم دیا۔ ماہِ محرّم میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان میں سے دو واقعے نہایت ہی اہم ہیں پہلا تو یہ کہ یکم محرّم کو حضرت عمر فاروقؓ شہید ہوئے وہ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ اور حضورؐ کے سُسر بھی تھے۔ ان کی بیٹی حضرت حفصہؓ حضورؐ کی بیوی تھیں۔ وہ دس سال چار ماہ مسلمانوں کے امیر رہے۔

دس محرّم کو حضرت حسینؓ کی شہادت کا دردناک واقعہ پیش آیا۔ آپؓ حضورؐ کے نواسے اور حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے فرزند تھے۔

خیبر کی مشہور لڑائی جس میں مسلمانوں نے یہودیوں کو شکست دی وہ بھی یکم محرّم الحرام کو ہوئی تھی۔ چار محرّم کو حضرت عثمانؓ کی بیعتِ خلافت ہوئی اور وہ تیسرے امیر المؤمنین بنے۔

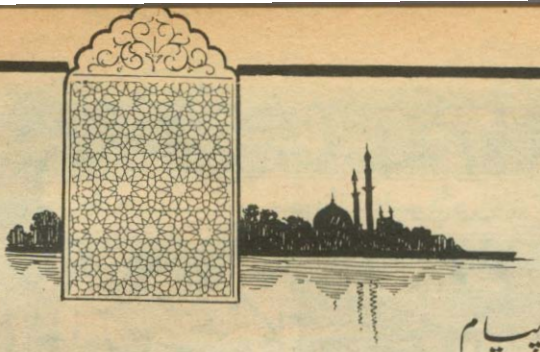

کربلا تیرے شہیدوں کو سلام

ہے حسینؑ ابنِ علیؑ کا یہ پیام
زندگی فانی شہادت کو دوام

جان دیتے ہیں جو حق کی راہ میں
حشر تک رہتا ہے باقی اُن کا نام

وہ جو ہوتے ہیں صداقت کے سفیر
موت کے صحرا میں کرتے ہیں قیام

جگمگاتا ہے شہیدوں کا لہو
جادۂ اسلام پر ہر ایک گام

لاالہ کے عکس اِس میں جلوہ گر
حق کا آئینہ ہے کردارِ امام

دیکھ اے نوعِ بشر شبیرؑ نے
اوج پر پہنچا دیا تیرا مقام

سربلندی دے گیا اسلام کو
ایک سجدہ زیرِ تیغِ بے نیام

دین کو اک روحِ تازہ بخش دی
کربلا تیرے شہیدوں کو سلام

فراست رضوی

گرے پڑے لوگ

محمد جاوید خالد

اُونچ نیچ اور ذات پات کے اندھیروں میں روشنیاں بکھیرتا ہوا ایک سچا واقعہ جس کا علم ہوتے ہی چھوٹے بابو کی زندگی بدل گئی۔

"چلو بھئی خدا بخش! اب تو دس منٹ اوپر ہو گئے۔" سلیم صاحب نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ سلیم صاحب جس دفتر میں افسر تھے وہاں خدا بخش ایک دفتری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ قدرت نے سلیم صاحب کو ایک دردمند دل سے نوازا تھا۔ چنانچہ ان کا معمول تھا کہ چھٹی کے بعد خدا بخش کو اپنی کار میں بٹھا لیتے اور خدا بخش کو، جس کا گھر ان کے قریب ہی تھا، اُتارتے ہوئے چلے جاتے۔ سلیم صاحب کی دوسری آواز پر خدا بخش نمودار ہوا۔

"کیا بات ہے بھئی؟" انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں سوال کیا۔ "آج گھر جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے کیا؟"

"صاب آپ چلے جائیں! میں بس سے آجاؤں گا۔" خدا بخش نے نظریں نیچی کیے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا کاظمی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں؟" کاظمی صاحب ان کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ "نئیں صاب دفتر تو سارا خالی ہو گیا۔" خدا بخش نے جواب دیا۔

"پھر؟" سلیم صاحب نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"صاب!! میں گریب (غریب) آدمی ہوں۔ میرے لیے بس ہی ٹھیک ہے۔ مجھے اپنی اوقات یاد رکھنی چاہیے۔ آپ جائیں میں بس سے آجاؤں گا۔" خدا بخش نے ہمت کر کے ایک ہی سانس میں یہ سارے جملے ادا کر دیے۔

"تم پر آج پھر امیری غریبی کا بھوت سوار ہوا ہے۔" سلیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نئیں صاب یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟" سلیم صاحب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تو چلو، رستے میں بات ہوگی۔" ان کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ کار میں بیٹھ کر انہوں نے خدا بخش کے لیے دروازہ کھول دیا، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟" عقبی شیشے سے سلیم صاحب نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ بات نئیں ہے صاب!" خدا بخش کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ "پھر یہ تم اچانک غریب کیسے بن گئے؟" شیشے کے پار دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"دیکھو خدا بخش!" سلیم صاحب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ہم افسر اور ماتحت ہیں لیکن تم خود گواہ ہو کہ میں اپنے ماتحتوں کو ذاتی نوکر نہیں بلکہ اپنے ہی جیسا انسان سمجھتا ہوں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نئیں صاب بالکل نئیں۔" خدا بخش نے زور زور سے گردن ہلائی۔

"پھر مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے؟" خدا بخش نے بہت بچنا چاہا مگر سلیم صاحب بھی دُھن کے پکے تھے۔ خدا بخش کو لب کھولنا ہی پڑے۔

"صاب بچے آپس میں کھیلتے ہیں، لڑتے بھی ہیں دوستی بھی کر لیتے ہیں۔ مجو (خدا بخش کا لڑکا) نے کئی بار شکایت کی کہ چھوٹے بابو (سلیم صاحب کا لڑکا) بہت جاستی (زیادتی) کرتے ہیں۔ گلط (غلط) کھیلیں گے اور جبردستی (زبردستی) ٹھیک بتائیں گے۔ مجو کچھ بولے تو ڈانٹ دیں گے۔ مجو روج (روز) رات کو مجھ سے پوچھے ہے کہ ابا ہم گریب ہیں اسی لیے چھوٹے بابو ڈانٹتے ہیں نا؟" خدا بخش سانس لینے کے لیے رکا۔ سلیم صاحب خاموش بیٹھے تھے مگر ان کا چہرہ جذبات سے سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ خدا بخش کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز پھر اُبھری۔ "کل شام کو بالکل جرا (ذرا) سی بات پر چھوٹے بابو نے مجو کو مارا اور اسے کھیل سے یہ کہتے ہوئے نکال دیا۔ چلے جاؤ پھر اسی کی اولاد۔۔۔۔ نیچ۔۔۔ تم بڑے لوگوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہو۔ صاب وہ بچہ ہے۔ عجیب عجیب سوال کرتا ہے۔ میں اُسے کہتا ہوں۔۔۔ جذبات کی شدت سے اُس کی آواز بھرا گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا۔ "ایڈوانس کی فکر اور جیادہ (زیادہ) کرائے کی پریشانی نہ ہوتی تو میں گھر ہی بدل لیتا۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی، سلیم صاحب نے ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی۔ تمام راستہ خاموشی رہی۔ خدا بخش سر اُٹھاتا سلیم صاحب کو دیکھتا پھر نیچے دیکھنے لگتا۔ کچھ اور بولنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس کا گھر قریب آیا تو گاڑی رُک گئی۔ جھجکتے جھجکتے اس نے سلیم صاحب سے کہا "صاب آپ چھوٹے بابو کو کچھ نہ کہیں میں مجّو کو سمجھاؤں گا۔" اس کی آواز پھر بھرّا گئی اور وہ جلدی سے نیچے اُتر گیا۔

"آؤ نصیبن آؤ" بڑی اماں نے چھالیہ کترتے ہوئے کہا۔ "صبح ہی صبح خیر تو ہے نا۔ میرا سلیم ٹھیک ہے؟ اس کے بیوی بچے سب خیریت سے ہیں نا؟" سلیم صاحب کی ملازمہ کو دیکھ کر انہوں نے ایک ہی سانس میں سارے سوال کر ڈالے۔

"بڑی اماں! سب ٹھیک ہیں۔" نصیبن نے سلام کرنے کے بعد کہا "مگر۔۔" "مگر کیا؟" بڑی اماں نے بے تابانہ پوچھا "مگر یہ کہ ۔۔۔" نصیبن نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"گھر کا ماحول بہت عجیب طرح کا ہو گیا ہے۔ ویرانی، خاموشی۔ صاب اپنے کمرے میں پڑے رہتے ہیں بیگم صاب اپنے کمرے میں۔ چھوٹے بابو کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔۔"

"ارے تو کیا سلیم دفتر بھی نہیں جاتا؟" بڑی اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں! پچھلے تین روز سے وہ دفتر بھی نہیں گئے۔ تین دن پہلے شام کو وہ دفتر سے گھر لوٹے تو سخت غصّے میں تھے آتے ہی چھوٹے بابو کے کان اینٹھنے شروع کر دیے۔ بیگم صاحبہ نے اس کی حمایت کی تو انھیں بھی سختی سے ڈانٹ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے دفتر کے چپراسی کے لڑکے کے ساتھ چھوٹے بابو نے نازیبا سلوک کیا تھا۔ صاحب کا غصہ ابھی تک دُور نہیں ہُوا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ انسان میں اگر اخلاق نہیں ہے تو وہ جانور ہے اور انہیں کیا ضرورت ہے کہ جانوروں کے لیے صبح سے شام تک کام کریں۔ انھوں نے چھوٹے بابو کو اسکول بھی نہیں جانے دیا۔ کہنے لگے اگر تعلیم تمھیں اخلاق نہیں سکھا سکتی تو اسکول جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

بڑی اماں خاموشی سے سب سُنتی رہیں۔ نصیبن بول چکی تو اُنھوں نے کہا "ٹھیک ہے تم چلو میں آرہی ہوں۔"

سخت حبس تھا۔ ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی۔ چارپائیاں کھلے صحن میں بچھی تھیں سب کروٹیں بدل رہے تھے۔ نیند کسی کو بھی نہیں آرہی تھی۔ بڑی اماں عشا کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر آئیں تو چھوٹا بابو بھی اُچھل کر ان کے پاس آگیا۔

"بڑی اماں نیند نہیں آرہی۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا "کوئی اچھی سی کہانی سُنا دیں نا۔" اس نے فرمائش کی۔

"کہانی سُناؤں گی اور ضرور سُناؤں گی مگر شرط یہ ہے کہ تم اسے ہمیشہ یاد رکھو گے۔"

"وعدہ رہا بڑی اماں۔" اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ بڑی ماں کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"تو سنو" بڑی ماں نے کہنا شروع کیا "بہت پہلے یہاں سے دُور، بہت دُور عرب کے مُلک پر ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔

یہ بادشاہ اپنی رعایا پر بہت مہربان تھا۔ رعایا کا حال معلوم کرنے کے لیے راتوں کو گشت کرنا اور ضرورت مندوں کے کام آنا اس کا معمول تھا۔ اس کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اُس نے راہ چلتے ہوئے اچانک پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پیچھے آنے والے مارے دہشت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ اس کے باوجود اس کی وسیع سلطنت میں کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ کسی شخص کے ساتھ زیادتی کر سکے۔ اس بہادر اور نیک بادشاہ نے جب اپنی سلطنت کو اللہ کے بتائے ہوئے اچھے طریقوں کے مطابق مضبوط کر لیا تو اس نے اللہ کے ان اچھے طریقوں کو پوری دنیا میں پھیلانے کا عزم کیا۔

"بڑی اماں"! چھوٹے بابو نے بات کاٹتے ہوئے کہا "وہ بادشاہ مسلمان تھا؟"

"ہاں بیٹا" بڑی اماں نے جواب دیا "پکا اور سچا مسلمان"۔

"اچھا تو میں بتا رہی تھی" بڑی اماں نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں چھوٹے بابو نے ٹوکا تھا "اس نیک بادشاہ نے مسلمان مجاہدوں کے لشکر تیار کر کے مختلف ملکوں کی طرف روانہ کیے۔ ان مجاہدوں نے ہر جگہ جا کر وہ اچھے طریقے بتائے جن لوگوں نے ان طریقوں کو دل سے مان لیا وہ ان کے بھائی ہو گئے اور جنہوں نے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں انکار کیا، ان سے مسلمان مجاہدوں نے مقابلہ کیا"۔ "پھر کون جیتا بڑی ماں؟" چھوٹے بابو نے فوراً سوال کیا۔

"بیٹے کامیاب وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ خدا کی مدد ہوتی ہے اور چونکہ مسلمان مجاہدوں کے ساتھ خدا کی مدد تھی اس لیے تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے دنیا کی بڑی طاقتوں ایران اور روم کو شکست دے دی۔ بڑھتے بڑھتے یہ مجاہد ایک ایسے شہر تک جا پہنچے جو بڑا برکت والا تھا اور نہایت مضبوط بھی۔ مجاہدوں نے اسے گھیر تو لیا مگر اس کو فتح کرنا سخت مشکل کام تھا۔ اچانک ایک عجیب و غریب بات ہوئی۔ اس شہر کے بڑے بڑے سرداروں نے مسلمان جرنیل سے کہا کہ

"ہم آپ کی بات ماننے کو تیار ہیں مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا بادشاہ خود ہمارے پاس آئے اور ہمیں سمجھائے"۔

"عجیب بے وقوف تھے وہ لوگ بھی" چھوٹے بابو نے پھر ٹوکا "بھلا اتنا بڑا بادشاہ کیوں چل کر جانے لگا"۔

"بادشاہ تو بے شک وہ بہت بڑا تھا" بڑی ماں نے کہا "مگر مسلمان جرنیل نے سوچا کہ ہم اپنے بادشاہ کو اطلاع کیے دیتے ہیں۔ پھر جیسا وہاں سے جواب آئے۔ چنانچہ انھوں نے قاصد کو روانہ کر دیا۔ بادشاہ کو یہ خبر ہوئی تو اس نے کہا "ناحق خون بہانا نہ تو مجھے پسند ہے اور نہ اللہ کو لہٰذا میں جانے کو تیار ہوں"۔

"کیا؟ بادشاہ تیار ہو گیا؟" چھوٹا بابو اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نہ صرف تیار ہو گیا بلکہ روانہ بھی ہو گیا"۔ بڑی اماں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب سنو اتنا بڑا بادشاہ روانہ کیسے ہوا۔ نہ خادم، نہ پہرے دار، نہ ہاتھی گھوڑے، نہ لاؤ لشکر، بس ایک اونٹ اور ایک غلام۔ یہ کاریں، بسیں، جہاز وغیرہ اس زمانے میں تھے بھی نہیں۔ سفر میں پڑاؤ کے لیے منزلیں ہوتی تھیں۔ بادشاہ اونٹ پر سوار ہوا اور غلام نے اونٹ کی نکیل

تھام لی، جب ایک منزل ختم ہوئی تو بادشاہ اونٹ سے نیچے اُتر آیا اور غلام سے کہا "اُونٹ پر سوار ہونے کی اب تمھاری باری ہے اور میں نکیل تھام کر چلوں گا۔"

"کیا؟" چھوٹے بابو کا منہ حیرت سے کھُلا رہ گیا۔ "بادشاہ نے واقعی یہ کہا؟"

"پھر کیا ہوا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر یہ ہوا کہ غلام نے لاکھ انکار کیا مگر اس عادل بادشاہ نے کہا "جیا میں انسان ہوں ویسے ہی تم۔ پھر جو سہولت مجھے ملے وہ تمہیں بھی ملنی چاہیئے۔" غلام کی ایک نہ چلی اسے اونٹ پر سوار ہونا ہی پڑا اور بادشاہ نکیل تھام کر آگے آگے چلنے لگا۔"

"ارے!" چھوٹے بابو کے منہ سے حیرت کے مارے بس اتنا ہی نکل سکا۔

"اور سنو!" بڑی اماں نے کہا "اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب سفر ختم ہونے میں صرف ایک منزل رہ گئی تو اونٹ پر بیٹھنے کی باری پھر غلام کی تھی۔ اب غلام نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "میرے مالک وہاں بڑے بڑے سردار آپ کے استقبال کو موجود ہوں گے، آپ اونٹ پر بیٹھے رہیں مگر بادشاہ نے انکار کر دیا اور کہا "خدا کی نظر میں سب برابر ہیں۔" شہر کے باہر مسلمان جرنیل، مجاہد اور غیر مسلموں کے بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ مگر وسیع و عریض سلطنت کا بادشاہ اس حال میں ان تک پہنچا کہ اس کا غلام اونٹ پر سوار تھا اور وہ خود اونٹ کی نکیل تھامے آگے آگے چل رہا تھا۔ شہر والوں نے فوراً شہر کی چابیاں اس نیک بادشاہ کے قدموں میں ڈال دیں۔"

چھوٹا بابو بُت بنا بیٹھا تھا۔ بہت دیر بعد وہ بولا "بڑی اماں وہ بادشاہ کون تھا؟"

"بیٹے۔" بڑی اماں نے جواب دیا "یہ بادشاہ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ تھے۔" یہ کہہ کر بڑی اماں خاموش ہو گئیں اور چھوٹا بابو بھی کافی دیر تک چُپ چُپ رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو، پھر وہ اچانک بول اُٹھا "بڑی اماں۔ "میں چاچا خدا بخش کے بیٹے مجو کو بہت تنگ کرتا ہوں۔۔۔ یہ غلط بات ہے نا؟"

"ہاں بیٹا یہ تو بُری بات ہے۔" "تو کیا تم اس پر شرمندہ ہو؟" بڑی اماں نے پوچھا۔

"ہاں اماں۔" چھوٹے بابو نے جواب دیا۔

"بس تو پھر تم صبح اس سے معافی مانگ لینا اور آئندہ کسی کو اپنے سے کم نہ سمجھنا۔ یاد رکھو دنیا کے سارے بگاڑ اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ایک شخص دوسرے کو اپنے برابر نہیں سمجھتا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں بڑی اماں" اس نے کہا اور بڑی اماں نے جھک کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

سلیم صاحب جو بظاہر آنکھیں بند کیے پڑے تھے انہوں نے بڑی اماں اور چھوٹے بابو کی پوری گفتگو سُن لی تھی۔۔۔

تھوڑی دیر بعد وہ اچانک بول اُٹھے "صبح جلدی اُٹھ جانا مُنّے کو اسکول اور مجھے دفتر جانا ہے۔"

کھلاڑی طوطے

حنا شہزاد

"بلّی کی نیت خراب ہے
بلّی کی نیت خراب ہے"

ہمارے پڑوسی کا طوطا بلّی کو گھر میں دیکھتے ہی اتنے زور سے یہ نعرہ دُہراتا ہے کہ اگر کوئی سویا ہُوا ہو تو جاگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر بلّی ذرا کم سن یا ناتجربہ کار ہو تو اس شور سے گھبرا کر بھاگ جاتی ہے۔ یہ طوطا اپنے ایسے ہی کئی کمالات کے باعث محلّے بھر میں پڑوسی کی شناخت کا ذریعہ بنا ہُوا ہے۔

طوطوں سے متعلق اسی قسم کے کئی واقعات آپ نے سُنے ہوں گے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق مغربی جرمنی میں ایک طوطے نے چور کو پکڑنے میں پولیس کی مدد کی۔

ہُوا یہ کہ چور صاحب چوری کر کے پیچھا کرنے والی پولیس پارٹی سے بچنے کے لیے ایک گھر میں گھُس گئے۔ بدقسمتی سے چور صاحب ایسی جگہ جا چھُپے جہاں پر ایک تیز طرّار سدھایا ہُوا طوطا موجود تھا۔ طوطے نے چور کو دیکھتے ہی زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ پولیس نے شور سُنا تو گھر میں داخل ہو گئی اور چور صاحب طوطے کو آنکھیں دکھاتے ہوئے قید خانے روانہ ہو گئے۔

ماہرینِ حیوانات کے مطابق اس وقت دُنیا میں طوطوں کی تقریباً سات سو اقسام پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر لمبی دُم والے طوطے، چھوٹی دُم والے طوطے اور مکاؤ طوطے وغیرہ۔ ان طوطوں میں ہر رنگ اور حجم کے طوطے شامل ہیں۔ ان طوطوں میں سے اکثر کو انسانوں کی طرح بولنا سکھایا جا سکتا ہے۔

تحقیق کے مطابق طوطے کا بچّہ چار یا پانچ ماہ کی عمر کے آس پاس انسانوں کی طرح بولنا سیکھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ طوطا عام طور پر اپنے استاد کے بتائے ہوئے الفاظ یا آوازوں کو ایک ہفتے سے لے کر ایک ماہ کے دوران ادا کرنا سیکھ لیتا ہے۔ بعض طوطے بولنے کے علاوہ مختلف قسم کی آوازیں نکالنے میں بھی مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کتّے کی طرح بھونکنا، یا ٹرین کی طرح سیٹی بجانا۔ امریکہ میں ایک طوطے نے جس کا پنجرہ کچن میں لٹکا رہتا تھا۔ ڈش واشر کی آواز نکالنا سیکھ لی۔

اب تو طوطوں کو باقاعدہ اداروں میں مختلف کرتبوں کی تربیت دی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر امریکی ریاست فلوریڈا میں واقع "طوطوں کا جنگل" نامی مقام پر طوطوں کو چھوٹے چھوٹے اسکوٹر چلانے اور باسکٹ بال کھیلنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں طوطوں کو اور بھی کئی طرح کے کرتب سکھائے جاتے ہیں۔ اس جنگل میں طوطوں سمیت مختلف اقسام کے گیارہ سو پرندے رکھے گئے ہیں۔ اس جنگل میں ان پرندوں کی زبردست دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

انسان حیوانات کو اپنے جیسا بنانے کے لیے نہ جانے کب سے کوشاں ہے۔ اپنی کوشش میں انسان اب تک خاصا کامیاب ہے۔ اس کوشش ہی کے نتیجے میں طوطوں کے علاوہ، بلّی، کُتّے، بندر، ڈولفن اور نہ جانے کون کون جانور انسانوں کی بہت سی حرکتیں سیکھ چکے ہیں۔

فلوریڈا کا جنگل، طوطوں کی جنّت

آئی لو یو جانوروں سے محبت کرنا خوبصورت بات ہے، مگر انسانوں سے محبت کرنا اس سے بھی زیادہ خوبصورت بات ہے۔ آپ تو جانتے ہیں نا!

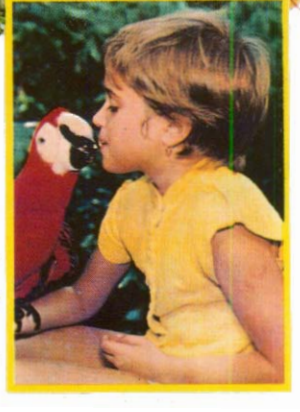

طوطوں کی عیاشی فلوریڈا کے طوطا جنگل میں ہر صبح پانچ افراد کا مستقل اسٹاف طوطوں کے لیے ایک سو نئے ٹرے ناشتہ تیار کرتا ہے۔ ناشتے میں کیلے، کینو اور کئی سبزیاں شامل ہوتی ہیں۔

صحت کا خیال ڈاکٹر کی ہدایت کے تحت طوطے کے بچے کی جسمانی صحت معلوم کرنے کے لیے اس کا وزن کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف دنیا کے لاکھوں بیمار انسان ساری زندگی ڈاکٹر کے دیدار سے بھی محروم رہتے ہیں۔

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے

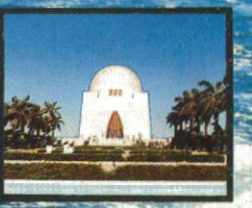

واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ

احمد کے حلوہ جات

ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے

MASS

سُرخ گلاب

یونس عامر

۱۴ اگست ۱۹۸۶ء

پیاری امّی جان، السلام علیکم!

یہ خط میں آپ کو انتہائی اہم خوشخبری سنانے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بہت خوش ہوں گی۔ ظاہر ہے بات ہی ایسی ہے۔ آج میری پاسنگ آؤٹ کی تقریب تھی۔ اب آپ کا بیٹا پاک وطن کا باقاعدہ سپاہی بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے بہترین کارکردگی کا انعام بھی ملا ہے۔ یقین کیجیے میں بہت خوش ہوں۔ اس موقع پر آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ کتنا جی چاہ رہا تھا کہ کاش آپ بھی یہاں ہوتیں اور اپنی آنکھوں سے مجھے شاندار وردی پہنے دیکھتیں۔ مجھے پیار کرتیں۔ چند دنوں بعد شاید چھٹیاں ملیں گی تب میں گھر آؤں گا۔ اب رات بہت ہوگئی ہے لیکن خوشی کے مارے نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور ہے۔ پیاری امّی اپنی صحت کا خیال رکھیے گا۔ کاش میں آپ کے پاس ہوتا اور آپ کی خدمت کر سکتا۔

گھر میں فرداً فرداً سب کو سلام۔ آپ کا بیٹا، شہاب

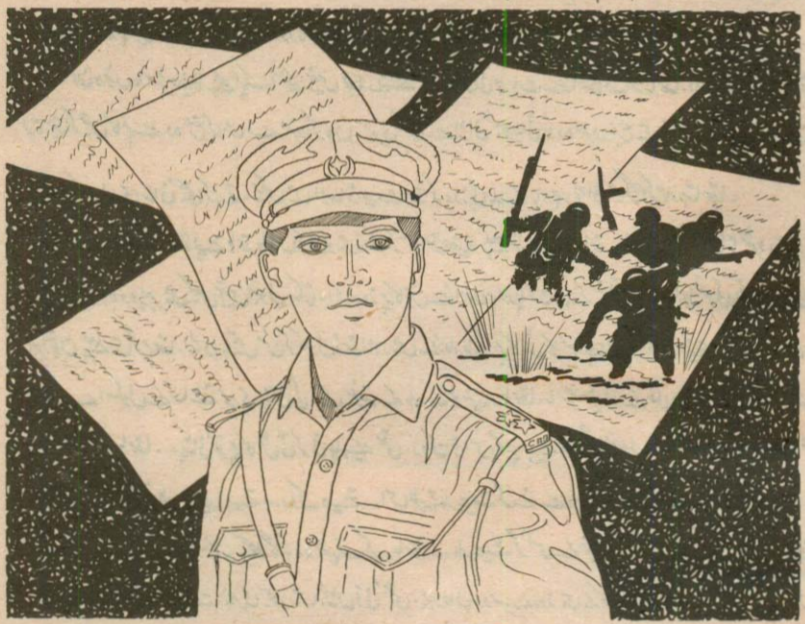

۲۱ر اکتوبر

پیاری امّی جان! میں بہت شرمندہ ہوں کہ کافی عرصے سے آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ دراصل میری ڈیوٹی آج کل ملٹری ورکشاپ میں لگی ہوئی ہے۔ ڈیوٹی کے بعد اتنا تھک جاتا ہوں کہ کسی اور کام کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ روز سوچتا تھا کہ خط لکھوں گا مگر عین وقت پر نیند آجاتی تھی۔ آج بڑی مشکل سے نیند کو جھگا کر خط لکھ رہا ہوں۔

امّی! میں اپنی موجودہ ڈیوٹی سے خوش نہیں ہوں۔ فوج میں آتے ہوئے تو میرے تصور میں کچھ اور ہی تھا، لیکن خیر دیکھئے یہاں کب تک رہنا پڑتا ہے۔

کبھی کبھی آپ لوگ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ دوست، احباب، اسکول کا زمانہ، گزرے ہوئے دن، اور جب یہ سب کچھ یاد آتا ہے تو میں بہت اُداس ہو جاتا ہوں۔ مجھے اسکول کے ماسٹر حفیظ صاحب یاد آتے ہیں تو میری پلکیں آنسوؤں سے نم ہو جاتی ہیں۔ انہیں کی وجہ سے تو میں آج اس مقام پر ہوں۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ آپ کو خوب یاد ہوگا کہ جب میں اسکول میں لڑتا جھگڑتا تھا تو وہ میری شکایت آپ سے کرتے تھے۔ انور مجید، گلو اور وہ شمیم باقرخانی، ان کی میں کتنی پٹائی کرتا تھا۔ وہ تھے بھی بدمعاش۔ لیکن اس وقت اسکول میں مجھ سے بڑا بدمعاش کون تھا۔ ہاں ایک روز جب میں نے ان کی دُھنائی کی تھی اور ماسٹر حفیظ کو جب اس بات کا پتا چلا تھا تو انھوں نے مجھے پوری کلاس کے سامنے مرغا بنا دیا تھا اور اس زور سے چھڑیاں ماری تھیں کہ دو روز تک ٹھیک سے بیٹھ نہیں پاتا تھا۔

ان دنوں ماسٹر حفیظ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ میں اُن کی ہر بات سے اختلاف کرتا تھا۔ اور ہمیشہ یہی کوشش کرتا تھا کہ جس کام سے وہ منع کریں اسے ضرور کروں۔ میری کسی سے لڑائی ہو جاتی تو وہ ضرور بیچ میں آجاتے۔ مجھے ڈانٹتے اور کبھی کبھی میری پٹائی بھی کرتے۔ لیکن میں ایسا ڈھیٹ تھا کہ روز کی مار کے باوجود لڑائی جھگڑا کرتا رہتا تھا۔

"دیکھ شہاب... تو اپنے ہاتھ پاؤں کو قابو میں رکھا کر" ماسٹر حفیظ کہتے مگر میرے ہاتھ پاؤں تو خود بخود چلنا شروع ہو جاتے تھے۔ وہ دوپہر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس روز پرکاش نے اسلام اور پاکستان کے متعلق بڑی غلط قسم کی باتیں کی تھیں۔ میرا خون پہلے ہی گرم تھا۔ ایسی باتیں سُن کر کھول اُٹھا اور میں نے مار مار کر پرکاش کا سر پھاڑ دیا۔ ماسٹر حفیظ نے مجھے روکا اور پھر پورے اسکول کے سامنے میری پٹائی کی۔ میں غصّے کے مارے کانپ رہا تھا۔ ماسٹر حفیظ کے خلاف تو دل میں نفرت کا طوفان اُمڈ رہا تھا... پٹائی تو پرکاش کی کرنی چاہیے تھی۔ روکنا تو اس کو چاہیے تھا مگر انھوں نے مجھے کیوں سزا دی؟

"بیٹے پرکاش کو زبانی طور پر سمجھا دیتے... روک دیتے... اس طرح مار پیٹ کرنے سے وہ وقتی طور پر تو خاموش ہو گیا ہے۔ مگر اب وہ اپنے دل میں ہمیشہ یہی سمجھے گا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا... مار پیٹ کر کسی کے خیالات تبدیل نہیں کیے جا سکتے۔"

ماسٹر حفیظ کی منطق اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہرحال دوسرے روز ہی پرکاش اپنے والد اور چند پولیس والوں

کے ساتھ اسکول آگیا۔ پولیس والے باہر کھڑے تھے پرکاش اور اس کے والد اسکول کے اندر آگئے۔ انہوں نے پہلے پرنسپل سے بات کی اور پھر میری کلاس میں آگئے۔ ماسٹر حفیظ اس وقت کلاس میں ہی تھے۔ پرکاش کا والد اٹرور سوخ رکھتا تھا۔ وہ مجھے تھانے لے جانے کے لیے آیا تھا۔ ایسے میں پرکاش نے مجھ سے بڑی بدتمیزی سے بات کی۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پرکاش پر چڑھ گیا ابھی اُس کے منہ پر دو مکے ہی جمائے تھے کہ اس کے والد نے مجھ کو مارنا شروع کر دیا۔ میں نے پرکاش کو چھوڑا اور اس کے والد کی طرف بڑھا۔ غصے سے میں اندھا ہو رہا تھا۔ ایسے میں ماسٹر حفیظ مجھ کو روکنے کے لیے آئے۔ انہوں نے مجھے پکڑنا چاہا مگر غصے میں آکر میں نے ان کو زور سے دھکا دیا۔۔ اور ماسٹر حفیظ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ ان کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ میں انہیں یوں دیکھ کر گھبرا گیا اور بھاگنے لگا۔ مگر کہاں بھاگ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں ہتھکڑیاں پہنے ہوئے تھانے کی طرف جا رہا تھا اور پورا اسکول دیکھ رہا تھا۔ راستے بھر میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آتے رہے۔ کبھی پھانسی کا تصور آتا تو کبھی ماسٹر حفیظ کا خون میں لتھڑا چہرہ۔ میرے خواب و خیال میں بھی یہ تصور نہ تھا کہ مجھ سے ایسی حرکت ہو سکتی ہے ... میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ پھر میں جیل کی کوٹھڑی میں تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیوں ہُوا اور پھر کیا ہوگا۔ اچانک ہی کوئی میرے سامنے آکھڑا ہُوا۔ میں نے دھڑکتے دل سے سامنے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ سامنے ماسٹر حفیظ کھڑے تھے۔ ان کے کپڑے خون سے سُرخ ہو رہے تھے۔ میں نے احساسِ جُرم کی وجہ سے نظریں جُھکا لیں۔ پھر تھانے دار نے جیل کا دروازہ کھول دیا اور میں باہر آگیا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا جب پتا چلا کہ ماسٹر حفیظ نے ہی مجھ کو ضمانت پر رہا کروایا ہے۔ پھر وہ مجھے لے کر گھر آگئے۔ اس وقت آپ گھر میں میری وجہ سے بہت پریشان تھیں اور اس وقت ماسٹر حفیظ نے وہ بات کہی جس نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا۔ انہوں نے کہا۔

"شہاب ... اگر تم میں اتنی ہی طاقت اور جذبہ ہے تو پھر تم فوج میں چلے جاؤ ... یہاں بے مقصد زندگی گزار کر تم آوارہ اور بدمعاش ہو جاؤ گے ... پاکستان فوج میں جا کر تم اپنے جوش اور جذبے سے نہ صرف پاکستان اور اسلام کی حفاظت کر سکتے ہو ... خدا کے واسطے اپنی اور اپنی والدہ کی زندگی کو جہنم نہ بناؤ ..."

آج بھی جب یہ جُملے میرے ذہن میں گونجتے ہیں تو میری آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔ میں نے تو ماسٹر حفیظ اور آپ کے خواب کو حقیقت کا روپ دینا چاہا تھا مگر خواب کی یہ تعبیر کیسی ہے ... میں تو فوج میں اسی لیے آیا تھا کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کروں لیکن ورکشاپ کی ڈیوٹی میں میرے سارے خواب خاک میں مل رہے ہیں۔

پیاری امّی خط بہت طویل ہو گیا ہے، لیکن یہ ساری باتیں میں کسی اور سے کر بھی تو نہیں سکتا۔ خدا کرے آپ اچھی ہوں۔

آپ کا بیٹا
شہاب

۵ر نومبر امی جی!

آپ کا جوابی خط ملا۔ پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ کیا بتاؤں۔ آپ نے مجھے صبر کرنے کو کہا ہے۔ صبر تو کرنا ہی ہوگا۔ امی! آج کل ہمارے شہروں میں دھماکے ہو رہے ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ ان کی وجہ سے مر رہے ہیں... کبھی کبھار تو میرا دل چاہتا ہے کہ یہاں سے بھاگ کر شہروں میں چلا جاؤں... میری ضرورت وہاں ہے... جہاں دشمن ہمارے معصوم اور نہتے لوگوں کو ہلاک کر رہا ہے۔ مگر فوج کی ٹریننگ نے مجھے برداشت کرنا سکھایا ہے... پتا نہیں میری خواہش کب پوری ہوگی۔ ویسے آپ فکرمند نہ ہوئیے گا۔ میں نے اپنے آفیسر سے کہا تھا۔ انہوں نے میرا ٹرانسفر کہیں اور کرنے کی بات کی ہے... دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

آپ کی دعاؤں کا طلب گار، آپ کا بیٹا، شہاب

۲۵ر مارچ پیاری امی جان...!

اتنے عرصے میں کہاں غائب رہا... بتا نہیں سکتا... بس یوں سمجھئے کہ اللہ نے میری دعائیں سن لی ہیں۔ کل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ محاذ پر جا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ اور بتا نہیں سکتا۔ انشاء اللہ محاذ پر سے خط لکھوں گا۔ دعا کرتی رہیے گا۔

آپ کا بیٹا، شہاب

۱۰ر اگست امی جان...!

اس وقت آپ کو سیاچن گلیشیئر سے خط لکھ رہا ہوں۔ سیاچن گلیشیئر پر اتنی سردی ہے کہ میری انگلیاں برف کی ڈلی بن گئی ہیں۔ دشمن نے اس گلیشیئر پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہماری ایک جھڑپ ہو چکی ہے۔ یہاں جنگ کرنا بہت مشکل ہے۔ موسم کی سختی کی وجہ سے نقل و حرکت میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اب اور لکھا نہیں جا رہا۔ آپ میری طرف سے فکرمند نہ ہوئیے گا۔

شہاب

۳ر ستمبر خاتونِ محترم، السلام علیکم!

آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے میرا سر فخر سے بلند ہے کہ آپ کا فرض شناس اور محبِ وطن بیٹا وطنِ عزیز کی حفاظت کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں شہید ہو گیا ہے۔ لیفٹیننٹ شہاب شہید سیاچن گلیشیئر کا شہید ہے۔ وہ درحقیقت سیاچن کا سُرخ گلاب ہے۔ دشمن کے قبضہ سے اپنی مقبوضہ چوکی چھڑاتے ہوئے شہاب نے شہادت کا جام لبوں سے لگایا۔ آپ کے نام اس کا آخری پیغام یہ تھا... "امی جان... آپ بالکل بھی نہیں روئیے گا۔ کیونکہ آپ ایک شہید کی ماں ہیں... اور شہیدوں کی مائیں روتی نہیں فخر کرتی ہیں۔"

شہاب شہید کی عمر صرف ۲۲ برس تھی مگر ان میں شہادت کی جو تڑپ تھی وہ میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تمام ساتھیوں پر بازی لے گیا۔ پاک وطن اور پاک فوج آپ کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔ جس نے ایسے عظیم فرزند کو جنم دیا۔

والسلام

کمانڈنگ آفیسر پاکستان آرمی۔

ان سب کے سر دھڑ اور پیروں کو ٹھیک ٹھیک جوڑ کر دیکھیں۔ یہ کون لوگ ہیں

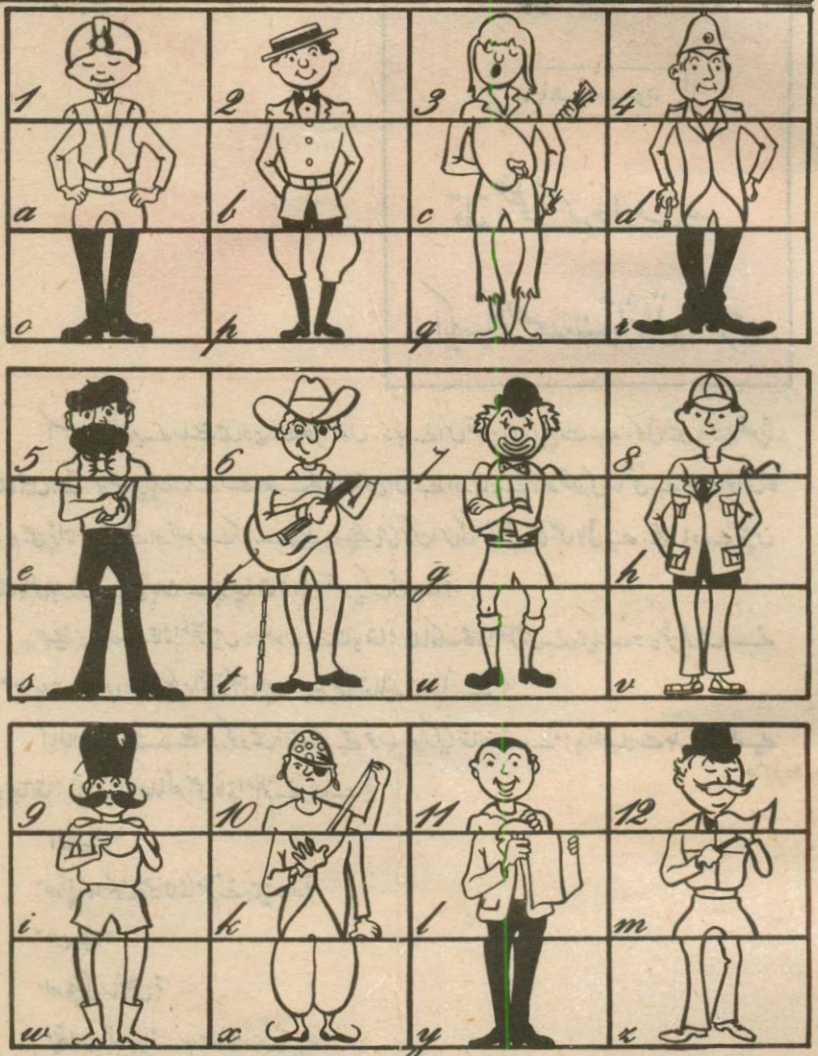

وہ ایک تصویر

طاہر مسعود

قائدِ اعظم کے حوالے سے ایک خوبصورت تاثراتی تحریر

اس تصویر کے سامنے میں دیر سے کھڑا ہوں ۔ نہ جانے اس تصویر میں کیا بات ہے ۔ کوئی ایسی بات جو تصویروں میں نہیں ہوتی ۔ یہ تصویر ایک زمانے سے ہمارے گھر میں آویزاں ہے اور ہمارے دُکھ سُکھ کی ساتھی ہے ۔ اب تو اس کا فریم بھی پُرانا ہو چکا ہے اور تصویر کے کنارے پیلے پڑ چکے ہیں لیکن اس کی کشش آج بھی باقی ہے ۔ مجھے یاد ہے، بچپن میں پہلی بار میں نے ابا جان سے پوچھا تھا: "ابا یہ تصویر کس کی ہے؟"

"بیٹے یہ ہمارے قائدِ اعظمؒ ہیں" انھوں نے بتایا تھا: "ہمارا ملک قائدِ اعظمؒ ہی نے بنایا ہے"۔ یہ سُن کر میں نے معصومیت سے کہا تھا: "لیکن امی تو کہتی ہیں ہر چیز اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے"۔

ابا جان ہنس پڑے تھے اور گود میں اُٹھا کے مجھے خوب پیار کیا تھا اور میں نے مزید تفصیلات جاننے کے لیے پوچھا تھا: "ابا، ابا کیا ہمارا گھر بھی قائدِ اعظمؒ نے بنایا ہے؟"

"ہاں بیٹے"

"اور آپی کا اسکول بھی قائدِ اعظمؒ نے بنایا ہے"

"ہاں بیٹے"

"اور پپو کی سائیکل؟"

"اچھا اب تم سو جاؤ ۔ بہت رات ہو گئی ہے"

اور سونے سے پہلے میں نے قائدِ اعظم کی تصویر کو غور سے دیکھا تھا۔ تصویر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جیسے پوچھ رہی ہو: کیا تم مجھے نہیں جانتے؟"

میں نے جھٹ کہا تھا: "نہیں، نہیں میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ قائدِ اعظم ہیں۔"

"ہاں تمہارا قائدِ اعظم!" تصویر نے کہا تھا اور پھر میں تکیے میں منہ چھپا کر سو گیا تھا۔

ابا جان کو مجھ سے بہت پیار تھا۔ جب میرا داخلہ اسکول میں ہو گیا تو وہ اکثر رات کو مجھے اسلامی تاریخ کے واقعات سنانے لگے۔ انھوں نے کبھی مجھے بادشاہ اور جادوگر کی، شہزادے اور دیو کی، جن اور پری کی کہانی نہیں سنائی۔ جب میں اُن سے ایسی کسی کہانی کی فرمائش کرتا تھا تو وہ کہتے تھے "تاریخ قصے کہانیوں سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہوتی ہے۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔ ان کے سنائے ہوئے واقعات اور شخصیات کے کارناموں میں کسی فرضی کہانی سے کہیں زیادہ دلچسپی ہوتی تھی۔

ابا نے مجھے قائدِ اعظم کی زندگی کے بھی بہت سے واقعات سنائے تھے جو مجھے خوب اچھی طرح سے یاد ہیں۔ وہ بتاتے تھے قائدِ اعظم کو اپنی تعلیم سے بہت دلچسپی تھی۔ رات کو جب گھر کے سارے بچے سو جاتے تو وہ ایک تختہ لیمپ کے سامنے کھڑا کر دیتے تاکہ روشنی سوئے ہوئے بچوں کی آنکھوں پر نہ پڑے اور پھر وہ رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ ایک رات ان کی بھابھی نے اتنی محنت کرتے دیکھ کر ان سے کہا: "اتنا مت پڑھا کرو جناح، ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔" قائدِ اعظم نے جواب دیا:

"میں ابھی سے محنت نہیں کروں گا تو زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکوں گا۔" ابا نے یہ بھی بتایا تھا کہ قائدِ اعظم جب اسکول میں پڑھتے تھے تو ان کے دوست محلے میں گولیاں کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا۔

"مٹی میں گولیاں نہ کھیلو، اس سے ہاتھ اور کپڑے دونوں گندے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں کھڑے ہو کر کرکٹ کھیلنا چاہیئے۔"

قائدِ اعظم کی اس ہدایت پر محلے کے لڑکوں نے گولیاں کھیلنا چھوڑ دیا۔ اور گندی گلی سے نکل کر کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ جہاں قائدِ اعظم نے اپنا کرکٹ کا بلّا اور وکٹ، ان کو لا کر دیے۔ جب وہ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہونے لگے تو انہوں نے اپنا بلّا ایک دوست کو دے دیا اور کہا۔

"میری غیر موجودگی میں تم لڑکوں کو کرکٹ کھیلنا سکھاتے رہنا۔" ابا بتایا کرتے تھے قائدِ اعظم نے نہایت وقار اور خود داری کے ساتھ زندگی گزاری۔ ہر طرح بچپن میں انھیں گولیاں کھیلنا ناپسند تھا کیوں کہ اس سے ہاتھ گندے ہو جاتے ہیں اسی طرح بڑے ہو کر انھوں نے ہر ایسے کام سے خود کو بچایا جس سے دامن داغدار ہوتا ہو۔ قائدِ اعظم نے نہایت محنت سے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ وہ اپنے والد کے ساتھ عدالت میں گئے تھے۔ جہاں انھوں نے ایک وکیل کو گاؤن پہنے اور گلے میں پٹا لٹکائے

دیکھا تھا تو انھیں بہت بھلا لگا تھا۔ انہوں نے اپنے والد سے کہا تھا "میں بڑا ہو کر بیرسٹر بنوں گا" ان کے والد کو کیا معلوم تھا کہ ان کا بیٹا واقعی ایک دن بیرسٹر بنے گا اور ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کا مقدمہ لڑ کر ان کے لیے ایک علیحدہ وطن بنائے گا۔

ابّا کو قائدِاعظمؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ کہتے تھے قائدِاعظمؒ کی زندگی میں ہمارے سیکھنے کی بے شمار باتیں ہیں۔ وہ بے انتہا بلند حوصلہ انسان تھے۔ جب وہ انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے لوٹے تو والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد کا کاروبار تباہ حال تھا۔ قائدِاعظمؒ کے لیے یہ دن بڑے بُرے تھے۔ لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنی بے پناہ محنت اور خداداد قابلیت سے بہت جلد حالات پر قابو پا لیا اور ایک قانون دان کی حیثیت سے اُبھرے۔ ایک دن جب ابّا قائدِاعظمؒ کی باتیں بتا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ابّا کیا آپ نے قائدِاعظمؒ کو دیکھا تھا؟ ابّا ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے جیسے کچھ یاد کر رہے ہوں پھر بولے۔

"میں نے ایک جلسے میں ان کی تقریر سُنی تھی۔ ان کی تقریر میں جو چیز سب سے نمایاں تھی وہ ان کی اپنی آواز تھی، نہایت پُراعتماد آواز۔ وہ انگریزی میں تقریر کرتے تھے اور مسلمان انگریزی سے ناواقف ہونے کے باوجود دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی تقریر سُنتے تھے۔ اور ان پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے قائدِاعظمؒ سچے اور دیانتدار انسان ہیں۔ انھیں نہ کوئی ڈرا سکتا ہے اور نہ ہی جھکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

ابّا جب قائدِاعظم کی باتیں کرتے تھے تو ان کے چہرے کا عجب تاثر ہوتا تھا۔ ان کی آواز کبھی بھاری اور کبھی اتنی دھیمی ہو جاتی تھی جیسے وہ اپنے آپ سے سرگوشی کر رہے ہوں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ قائدِاعظمؒ جب سیاست میں آئے تو مسلمان ایک منتشر قوم تھے، کسی بکھرے ہوئے ریوڑ کی طرح۔ قائدِاعظمؒ نے انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ان میں ایک نئی روح پھونکی۔ وہ بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں کی آزادی اور خوشحالی کے لیے انھوں نے اپنی صحت کی بھی کبھی پروا نہ کی "کام، کام اور کام" وہ کہتے تھے۔ انھیں نوجوانوں سے بڑی توقعات تھیں۔ وہ ان سے محبت بھی بہت کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی زندگی میں وصیت کر دی تھی کہ ان کے بعد ان کی دولت سندھ مدرسہ اسکول اسلامیہ کالج پشاور اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تقسیم کر دی جائے۔

ابّا کی پرانی عادت تھی کہ وہ صبح سویرے اخبار پڑھا کرتے تھے۔ اور جب وہ اخبار میں سیاسی ہنگاموں کی خبریں پڑھتے تو پتہ نہیں کیوں ان کی نگاہ خود بخود قائدِاعظمؒ کی تصویر کی طرف اُٹھ جاتی۔ میں نے اکثر دیکھا تھا ایسے موقع پر ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں تب میں سوچتا تھا قائدِاعظمؒ کی تصویر میں ایسی کیا بات ہے جو اُنھیں بے چین کر دیتی ہے۔

اب خیال آتا ہے شاید وہ قائدِاعظم کے پاکستان کو مسائل میں گھرا دیکھ کر مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔

قائدِاعظم کی یہ تصویر جس کے سامنے میں دیر سے کھڑا ہوں ۔۔۔ اس تصویر سے میرے بچپن کی ان گنت یادیں وابستہ ہیں۔ وہ واقعہ تو میرے ذہن میں آج بھی تازہ ہے جب مجھ پر تن سازی کا جنون طاری ہو گیا تھا۔ میں پڑھائی لکھائی چھوڑ کر ہر وقت اپنی صحت بنانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ ایک شام ابّا نے مجھے بلایا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولے۔

"بیٹے! یہ اچھی بات ہے کہ تم اپنی صحت پر توجہ دے رہے ہو۔ زندگی میں ترقی کرنے کے لیے جسمانی لحاظ سے چاق و چوبند ہونا ضروری ہے۔ لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ انسان کی اصل طاقت اس کے جسم میں نہیں اس کے ذہن اور کردار میں پوشیدہ ہوتی ہے۔"

یہ سُن کے میں نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے "اگر تم میری بات سمجھنا چاہتے ہو تو اس تصویر کو غور سے دیکھو۔" انھوں نے قائدِاعظم کی تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "تمھیں میری بات سمجھ میں آجائے گی۔" تصویر میں قائدِاعظمؒ دُبلے پتلے اور کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ ابا سچ ہی تو کہہ رہے تھے۔ اگر جسمانی طاقت ہی سب کچھ ہوتی تو قائدِاعظم محض ایک عام آدمی ہوتے یہ کردار، عزم و ارادہ اور لیاقت و قابلیت ہی تو تھی جس نے نحیف اور بیمار محمد علی جناح کو قائدِاعظم بنا دیا۔ اسی دن سے میری توجہ پڑھائی کی طرف بڑھ گئی۔ پڑھتے پڑھتے جب کتاب پر سے نظریں اُٹھا کر تصویر کی طرف دیکھتا تو ایسا لگتا جیسے قائدِاعظم کے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ ہے۔

ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ابا کو مجھ سے بہت پیار تھا لیکن میں یہ کبھی فیصلہ نہ کر سکا کہ ابا کو مجھ سے زیادہ محبت تھی یا قائدِاعظمؒ سے۔ ابا کی صحت دن بہ دن خراب رہنے لگی تھی۔ انھوں نے دفتر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ قائدِاعظمؒ کی باتیں بھی بہت کم کرتے تھے۔ اس رات جب اُن کی حالت بگڑی تو میں اُن کے سرہانے موجود تھا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں کسی آیت کا ورد کر رہے تھے اور میں ان کے سر کو اپنی گود میں لیے بار بار پوچھ رہا تھا

"کیا ہوا ابا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

اگلی دوپہر قبرستان سے واپسی پر جب میں گھر لوٹا تو ابا کی خالی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میں چُپ چاپ اس پر بیٹھ گیا۔ سامنے قائدِاعظم کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا ہوا۔ میں اُٹھا اور سحر زدہ قدموں سے چلتے ہوئے تصویر کے پاس پہنچا۔ قائدِاعظم۔ ابا مر گئے!"

اور یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

سفرِ مبارک

معلومات بھی ـــــ رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کر سکتے ہیں

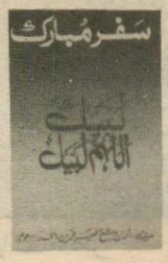

ہوکے سے ہاکی تک

ہاکی سے متعلق ایسی دلچسپ اور اہم معلومات

جن سے شاید ہاکی کے کھلاڑی بھی واقف نہ ہوں۔

شین فاروقی

ہاکی کا کھیل دنیا میں کب اور کہاں شروع ہوا اس کے بارے میں ماہرین کے درمیان ابھی تک اتفاقِ رائے نہیں ہو سکا ہے۔ تاہم اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ ہاکی دنیا کے قدیم ترین کھیلوں میں سے ایک ہے۔

ہاکی کی ابتدا کے بارے میں کئی مفروضات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے مطابق یہ آئرلینڈ میں کھیلے جانے والے کھیل ہلنگ کی سدھری ہوئی شکل ہے۔ یہ کھیل ۱۲۷۲ء قبل مسیح کے آس پاس آئرلینڈ میں بے حد مقبول تھا۔ تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہاکی اس سے بھی پہلے یعنی ۲۰۰۰ء قبل مسیح ایران میں کھیلا جاتا تھا۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں یہ افراد ایران میں واقع نیلی گھائی نام کے مقبرے کی مثال دیتے ہیں۔ اس مقبرے میں چھ اقسام کے کھیلوں کی تصاویر کندہ ہیں۔ ان تصاویر میں کچھ تصاویر ایسی بھی ہیں جن میں دو افراد ہاکی جیسی لکڑیاں پکڑے آمنے سامنے کھڑے ہیں اور ان لکڑیوں کے نیچے چھلے نما گیند رکھی ہوئی ہے۔

۵۰۰ سال قبلِ مسیح کے یونان میں کھیلی جانے والی ہاکی کا ایک منظر

خیال ہے کہ ایران سے نکل کر ہاکی کا کھیل یونان پہنچا اور پھر وہاں سے دنیا کے دوسرے خطّوں میں پھیل گیا۔ قرونِ وسطیٰ میں ہاکی سے ملتا جلتا ایک کھیل فرانس میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ جسے "ہوکے" کہا جاتا تھا۔ اُردو میں فرانسیسی لفظ ہوکے کے معنی گڈریے کی مُڑی ہوئی چھڑی کے ہیں۔ اسے حُسنِ اتفاق کہیے کہ ہوکے کی طرز کا ایک کھیل اسکاٹ لینڈ میں بھی کھیلا جاتا تھا جسے شنٹی کہا جاتا تھا۔ خیال ہے کہ جب انگلستان کے لوگوں نے اس کھیل کو اپنایا تو انھوں نے اس کے نام میں تبدیلی کر کے اُسے ہاکی کر دیا۔

انگلستان کی سرزمین ہاکی کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاکی انگلستان میں مقبول ہوتا چلا گیا۔ تاہم یہ پُرانے طرز کی ہاکی تھی۔ جدید ہاکی سے بڑی حد تک مشابہت رکھنے والے کھیل کا آغاز انگلستان میں ۱۸۷۵ء کے آس پاس ہوا۔ اُس وقت اس کھیل کے قوانین بڑے عجیب و غریب تھے۔ مثلاً ایک قانون تھا کہ گول کرنے کے لیے کھلاڑیوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ گیند کو گول پوسٹ کے پندرہ میٹر سے ہٹ لگا کر گول میں ڈالیں گے تو گول ہوگا ورنہ نہیں۔ چونکہ اُس وقت پندرہ میٹر کا کوئی نشان میدان میں موجود نہیں ہوتا تھا اس لیے کھلاڑیوں کو اندازے سے ہٹ لگانا پڑتی تھی۔ ظاہر ہے اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم ۱۸ر جنوری ۱۸۸۶ء کو لندن میں باقاعدہ ہاکی ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے ہٹ لگانے کے قانون میں تبدیلی کی اور گول پوسٹ سے مخصوص فاصلے پر ایک دائرہ کھینچوا دیا۔ جسے جدید ہاکی کی اصطلاح میں ڈی کہتے ہیں۔

ہاکی کا پہلا بین الاقوامی میچ ۱۹۰۰ء میں انگلستان اور آئرلینڈ کے درمیان کھیلا گیا جس میں انگلستان نے آئرلینڈ کو صفر کے مقابلے میں پانچ گول سے شکست دے کر اپنے عمدہ کھیل کی دھاک بٹھا دی۔

ابتدا میں ہاکی آج کی طرح نہیں کھیلی جاتی تھی۔ اُس زمانے میں ہاکی کی گیند ٹھوس ربر کی ہُوا کرتی تھی اور ہاکی کا میدان ۱۸۰ر سے ۲۰۰ میٹر کے درمیان ہُوا کرتا تھا۔

وسطی دور کے فرانس میں کھیلی جانے والی ہاکی کا ایک منظر

ایران میں ۲۰۰۰ سال قبلِ مسیح کی ہاکی اور چھلّہ نما گیند

اس زمانے میں ہاکی کے کھلاڑیوں کا انتخاب ان کی تکنیکی مہارت کی بجائے جسمانی طاقت کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ کیونکہ اُس زمانے میں جسمانی فاؤل کا کوئی قانون موجود نہیں تھا چنانچہ خیال کیا جاتا تھا کہ جو کھلاڑی جتنا زیادہ طاقت ور ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ دوسری ٹیم کے کھلاڑیوں کو دھکا مکی کے ذریعہ خوف زدہ کر سکے گا اور یوں زیادہ سے زیادہ گول کر سکے گا۔ چنانچہ اس زمانے میں کھلاڑی گیند پر اس طرح ایک ساتھ ٹوٹ کر پڑتے تھے گویا کھیل نہ ہو رہا ہو، کوئی جنگ ہو رہی ہو۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بھولو، اکرم اور اسی طرح کے پہلوان حضرات اگر اس زمانے میں ہوتے تو یقیناً دنیا کے مانے ہوئے ہاکی کے کھلاڑی ہوتے۔ اور اپنے خیف خان حسن سردار اور سمیع اللہ تو اس زمانے میں سلیکٹ ہی نہ ہو پاتے۔

تاہم ۲۰ ویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہاکی کے کھیل کے باقاعدہ قوانین وجود میں آگئے۔ ہاکی کے قوانین بنانے کا سہرا فیڈریشن آف انٹرنیشنل ہاکی کے سر ہے جس کا قیام ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا۔ ایف آئی ایچ کے قیام کے بعد دنیا کے تمام ہاکی کھیلنے والے ممالک میں ہاکی کے یکساں قوانین اپنائے جانے لگے۔

ہاکی کے کھیل کو ۱۹۰۸ء میں اولمپک کھیلوں میں شامل کیا گیا۔

برِصغیر میں ہاکی، کرکٹ اور دوسرے کئی کھیلوں کی طرح انگریزوں کے ذریعہ پہنچا۔ برِصغیر میں پہلا ہاکی کلب ۱۸۸۵ء میں قائم ہوا۔ اس کلب کے قیام کے دس برسوں بعد ہاکی پورے برِصغیر میں ایک مقبول کھیل بن گیا۔

برِصغیر کی ہاکی ٹیم نے پہلی بار ۱۹۲۸ء کے اولمپک میں حصّہ لیا۔ اور اپنے شاندار کھیل کی بدولت سونے کا تمغہ

حاصل کر کے پوری دنیا کو چونکا دیا۔ اس کے بعد برسوں تک برِصغیر کی ٹیم ہاکی کے آسمان پر درخشندہ ستارے کی طرح چمکتی رہی۔

ہر کھیل کی طرح ہاکی کے بھی کچھ عظیم کھلاڑی گزرے ہیں۔ ان عظیم کھلاڑیوں میں بھارت کے دھیان چند کا ہاکی میں وہی مقام ہے جو کرکٹ میں ڈان بریڈمین کا۔ دھان پان دھیان چند کو عالمگیر شہرت اُن کے بہترین بلکہ ناقابلِ یقین اسٹک ورک کی بدولت حاصل ہوئی۔ دھیان چند اپنے جادوئی کھیل کی بدولت ہاکی کی دنیا میں اپنی ذات سے متعلق کئی دلچسپ اور ناقابلِ فراموش واقعات چھوڑ گئے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں جب برِصغیر کی ہاکی ٹیم برلن اولمپک میں حصہ لینے گئی تو دھیان چند کا کھیل دیکھ کر تماشائیوں کو شک ہوا کہ کہیں ان کی اسٹک میں مقناطیس تو فٹ نہیں؟ شک کی وجہ یہ تھی کہ دھیان چند جب بھی اسٹک کے ذریعہ گیند لے کر دوڑتے تھے تو یوں محسوس ہوتا کہ گیند اُن کی اسٹک سے چپک گئی ہے۔ چنانچہ بات یہاں تک بڑھی کہ ٹورنامنٹ کے منتظمین نے دھیان چند سے درخواست کی کہ وہ دوسری اسٹک سے کھیلیں۔ دھیان چند نے مسکراتے ہوئے دوسری اسٹک سے کھیلنا شروع کیا اور پھر تابڑ توڑ گول کر کے منتظمین اور تماشائیوں کو یقین دلا دیا کہ اُن کا شاندار کھیل ان کے اسٹک ورک کا کمال ہے نہ کہ کسی مقناطیس کا۔

پاکستان نے بھی ہاکی کے کئی عظیم کھلاڑی پیدا کیے ہیں، جن میں نصیر بُندا، خالد محمود، اصلاح الدین، شہناز شیخ، سمیع اللہ، حسن سردار، اور حنیف خان شامل ہیں۔ ان کھلاڑیوں میں سے دو کھلاڑیوں یعنی شہناز شیخ، اور سمیع اللہ نے اپنے شاندار کھیل کی بدولت بالترتیب "برق" اور "اُڑنے والے گھوڑے" کا خطاب حاصل کیا ہے۔

اب تو دنیا میں ہاکی نے بہت ترقی کر لی ہے اور اس کی کئی قسمیں وجود میں آگئی ہیں۔ ان میں ایک آئس ہاکی بھی ہے۔ اب مردوں کے علاوہ خواتین بھی ہاکی کے میدان میں کود پڑی ہیں اور مردوں کی طرح اُن کی ٹیمیں بھی بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لینے لگی ہیں۔

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف:۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مفت منگوانے کے لیے
صرف ۲۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجئے۔

میں مزارِ قائدِ اعظم پہ جاؤں گا.. مگر..

شاہ نواز فاروقی

آج ہے گیارہ ستمبر
قائدِ اعظمؒ کا یومِ انتقال

میری خواہش ہے برائے فاتحہ جاؤں وہاں
نیند کے عالم میں ہیں لیٹے ہوئے قائدِ جہاں

پر یہ ڈر ہے
اُس جگہ پر روحِ قائدؒ آن کر
پیار سے اک سادہ و معصوم بچّہ جان کر

پوچھ لے نہ مجھ سے یہ مشکل سوال
پاک دھرتی کے ہیں کیسے حال چال ؟

میں تو بچّہ ہوں
اُنہیں کیسے بتاؤں گا بھلا
کاٹتا ہے کس لیے اک بھائی بھائی کا گلا

سوچتا ہوں میں اُنہیں کیسے بتاؤں گا کہ یاں
کس لیے بھولے ہوئے ہیں لوگ سب اسلام کو

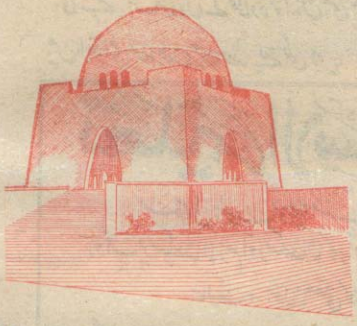

چاہتوں کے درس کو

پیارے نبیؐ کے کام کو

میں اُنہیں کیسے بتاؤں گا بھلا ہم لوگ سب

بے دھڑک گھر سے نکلتے کیوں نہیں ہیں شام کو

سوچتا ہوں میں اُنھیں کیسے بتاؤں گا کہ ہم

لوگ سب آپس میں کیوں ناراض ہیں

میں تو بچّہ ہوں

یہ باتیں سب کی سب میرے لیے

ایک گہرا خوف ہیں اور ایک گہرا راز ہیں

آج ہے گیارہ ستمبر

قائدِ اعظمؒ کا یومِ انتقال

میں مزارِ قائدِ اعظمؒ پہ جاؤں گا مگر

اپنے کانوں میں روئی کی گولیوں کو ٹھونس کر

کاغذی شیر

یہ محاورہ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ اس کا مطلب ہے ایسا آدمی جو بہادری کی باتیں تو کرتا ہو لیکن حقیقتاً بہادر نہ ہو۔ آپ کے اِرد گِرد ایسے بہت سے لوگ موجود ہوں گے۔ ممکن ہے آپ کے دشمن آپ کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو بھی ہمیں آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اس لیے کہ آپ کی عمر میں کاغذی شیر ہونا ایک فطری بات ہے۔

خیر اگر آپ کاغذی شیر نہیں ہیں اور نہ ہی آپ نے کاغذی شیر دیکھا ہے تو برائے مہربانی برابر والے صفحے پر نظر ڈالیے کہ وہاں ایک کاغذی شیر آپ کا منتظر ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق یہ شیر بہت دنوں سے سو رہا ہے لیکن اگر آپ اسے جگا کر اس کی دہاڑ سننا چاہتے ہیں تو ہماری تین ہدایات پر عمل کیجیے۔

۱ ——— اس طرح کی لائن پر قینچی چلا کر تصویر کاٹ لیجیے۔

۲ ------ اس طرح کی لائن پر سے کاغذ کو موڑ لیجیے۔

۳ ..... اس لائن پر سے کاغذ کو دو حصّوں میں موڑ دیجیے۔

لیجیے کاغذی شیر تیار ہے! آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ تو دہاڑا ہی نہیں۔! ذرا دیکھیے آپ سے کوئی تکنیکی غلطی تو نہیں ہوگئی۔

شیر بنائیے

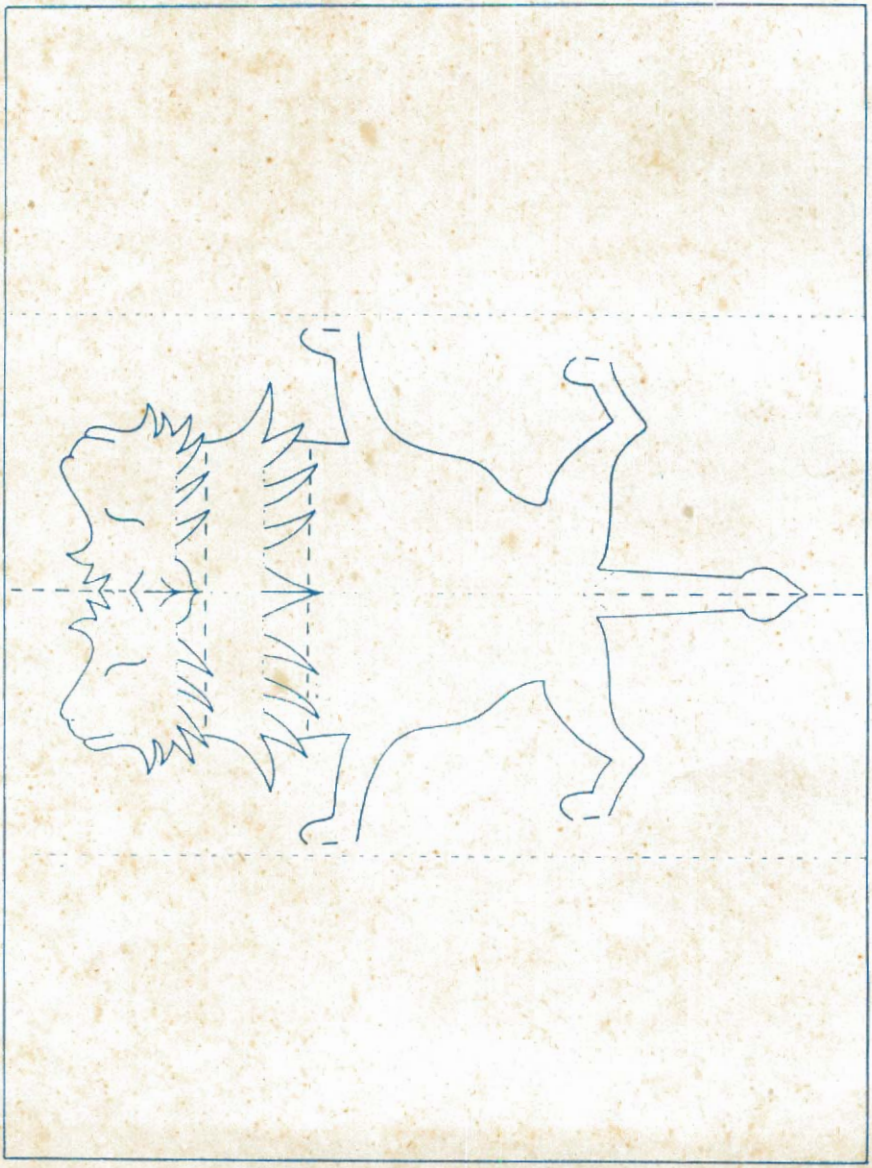

ضیاء الرحمٰن ضیاء

اولمپک یونان سے سول تک

عالمی کھیلوں کے سب سے بڑے اجتماع کا دلچسپ اور معلوماتی احوال

اس سال ۱۷ر ستمبر سے ۲ر اکتوبر تک، چوبیسویں اولمپک کھیل، جنوبی کوریا (صحیح تلفظ کُریا) کے دارالحکومت سول میں ہوں گے۔ (سول کو اکثر لوگ سیول کہتے ہیں جو غلط ہے۔)

اولمپک کھیلوں کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا آغاز اب سے کوئی ساڑھے تین ہزار برس پہلے ہوا تھا، لیکن اس زمانے کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ جولائی ۷۷۶ ق م (قبل مسیح) (تقریباً پونے تین ہزار سال پہلے) سے ان کھیلوں

کے باقاعدہ ریکارڈ ملتے ہیں۔ اس لیے قدیم اولمپک کھیلوں کے آغاز کا یہی سنہ درست سمجھا جاتا ہے۔

قدیم اولمپک کھیل ہر چوتھے سال، موجودہ یونان کے مقام اُولمپیا میں ہوتے تھے۔ اس شہر کے شمال میں اولمپس نامی پہاڑی تھی جس کی وجہ سے ان کھیلوں کو یہ نام دیا گیا۔ ایک ہزار سے زیادہ عرصے تک جاری رہنے والے ان کھیلوں کا سلسلہ

۳۹۳ء میں رومی شہنشاہ تھیوڈوسیئس اوّل کے عہد میں ختم ہوگیا۔ پھر زلزلے اور دریاؤں کا رُخ تبدیل ہونے سے اولمپیا اور اس کے قریب کے علاقے مٹی کے نیچے چھپ گئے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخری زمانے میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کُھدائی کے نتیجے میں اولمپیا کے آثار دریافت ہوئے اور دنیا کو اولمپک کھیلوں کی قدیم تاریخ کا پتہ چلا۔ چنانچہ کھیلوں سے محبت کرنے والے افراد نے اولمپک کھیلوں کے دوبارہ آغاز کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کردار ایک فرانسیسی نوجوان "پیئر ڈی فریڈی بیرن ڈی کوبر تین" نے انجام دیا۔ ۱۸۹۴ء میں آئی او سی یعنی انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی قائم کی گئی اور ۶ راپریل ۱۸۹۶ء کو یونان کے دارالحکومت ایتھنز میں پہلے جدید اولمپک کھیلوں کا افتتاح کیا گیا اور اس کے بعد سے قدیم اولمپک کھیلوں کی طرح جدید اولمپک کھیل بھی ہر چوتھے سال منعقد کیے جاتے ہیں۔ اولمپک کا سال یا دو اولمپک کھیلوں کے درمیان وقفہ اولمپیاڈ کہلاتا ہے۔ ہر چوتھے سال اگر مقابلے کسی وجہ نہ ہو سکیں تب بھی ترتیب میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۶ء میں پہلی اور ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۴ء میں دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے اولمپک کھیل منعقد نہیں کیے گئے لیکن وہ بھی فہرست میں شامل ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں یونان کے دارالحکومت ایتھنز میں ہونے والے اولمپک کھیل دو سال بعد ہوئے تھے اس لیے ان کا شمار نہیں کیا جاتا لیکن اُن کھیلوں میں کھلاڑیوں نے جو تمغے حاصل کیے وہ ریکارڈ میں شامل ہیں۔

اب تک زیادہ تر اولمپک کھیل برِاعظم یورپ میں ہوئے ہیں۔ دنیا کے سات برِاعظموں سے افریقہ، جنوبی امریکہ اور انٹارکٹیکا... تین برِاعظم ایسے ہیں جہاں ایک بار بھی ان کھیلوں کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ دنیا کے سب سے بڑے برِاعظم ایشیا، اور آسٹریلیا کو صرف ایک ایک بار ان کھیلوں کی میزبانی کا اعزاز بخشا گیا۔ شمالی امریکہ میں پانچ مرتبہ اور برِاعظم یورپ میں ۱۳ مرتبہ یہ کھیل ہو چکے ہیں۔ اولمپک کھیل ملکوں کے بجائے شہروں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ فرانس کا دارالحکومت

SITES OF OLYMPIC GAMES, 1896-1984

پیرس، انگلینڈ کا دارالحکومت لندن اور امریکہ کا شہر لاس اینجلس تین ایسے شہر جو دو دو مرتبہ اولمپک کھیلوں کے میزبان بن چکے ہیں۔ صرف امریکہ ایک ایسا ملک ہے جس کے دو شہروں (سینٹ لوئی اور لاس اینجلس) کو جدید اولمپک کھیلوں کی میزبانی کا اعزاز حاصل ہوا۔ جدید اولمپک کھیلوں کی تفصیلات یہ ہیں۔

اولمپیاڈ	سال	مقام	تاریخ	مقابلے	شریک اقوام	کھلاڑیوں کی تعداد
۱	۱۸۹۶ء	ایتھنز (یونان)	۶ - ۱۵ اپریل	۴۱	۱۳	۳۱۱
۲	۱۹۰۰ء	پیرس (فرانس)	۲۰ مئی/۲۸ اکتوبر	۸۹	۲۲	۱۳۳۰
۳	۱۹۰۴ء	سینٹ لوئی (امریکہ)	یکم جولائی - ۲۳ نومبر	۹۶	۱۳	۶۲۵
	۱۹۰۶	ایتھنز (یونان)	۲۲ اپریل - ۲ مئی	۷۵	۲۰	۸۸۴
۴	۱۹۰۸	لندن (انگلینڈ)	۲۷ اپریل - ۳۱ اکتوبر	۱۰۹	۲۲	۲۰۵۶
۵	۱۹۱۲	اسٹاک ہوم (سویڈن)	۵ مئی - ۲۲ جولائی	۱۰۲	۲۸	۲۵۴۶
۶	۱۹۱۶	برلن (جرمنی)	پہلی جنگِ عظیم کی وجہ سے منعقد نہیں کیے جا سکے۔			
۷	۱۹۲۰	اینٹورپ (بیلجیئم)	۲۰ اپریل - ۱۲ ستمبر	۱۵۰	۲۹	۲۶۹۲
۸	۱۹۲۴	پیرس (فرانس)	۴ مئی - ۲۷ جولائی	۱۲۸	۴۴	۳۰۹۲
۹	۱۹۲۸	ایمسٹرڈیم (ہالینڈ)	۱۷ مئی - ۱۲ اگست	۱۰۹	۴۶	۳۰۱۴
۱۰	۱۹۳۲	لاس اینجلس (امریکہ)	۳۰ جولائی - ۱۴ اگست	۱۱۶	۳۷	۱۴۰۸
۱۱	۱۹۳۶	برلن (جرمنی)	یکم - ۱۶ اگست	۱۲۹	۴۹	۴۰۶۶
۱۲	۱۹۴۰	ٹوکیو (جاپان)	بعد ازاں۔ دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے منعقد نہیں کیے جا سکے۔			
		ہیلسنکی				
۱۳	۱۹۴۴	لندن (انگلینڈ)	دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے منعقد نہیں کیے جا سکے۔			
۱۴	۱۹۴۸	لندن (انگلینڈ)	۲۹ جولائی - ۱۴ اگست	۱۳۶	۵۹	۴۰۹۹
۱۵	۱۹۵۲	ہیلسنکی (فن لینڈ)	۱۹ جولائی - ۳ اگست	۱۴۹	۶۹	۴۹۲۵
۱۶	۱۹۵۶	میلبورن (آسٹریلیا)	۲۲ نومبر - ۸ دسمبر	۱۵۰	۶۷	۳۱۸۴
۱۷	۱۹۶۰	روم (اٹلی)	۲۵ اگست - ۱۱ ستمبر	۱۵۲	۸۳	۵۳۴۶
۱۸	۱۹۶۴	ٹوکیو (جاپان)	۱۰ - ۲۴ اکتوبر	۱۵۸	۹۳	۵۱۴۰
۱۹	۱۹۶۸	میکسیکو سٹی (میکسیکو)	۱۲ - ۲۷ اکتوبر	۱۷۰	۱۱۲	۵۵۳۰

اولمپیاڈ	سال	مقام	تاریخ	مقابلے	شریک اقوام	کھلاڑیوں کی تعداد
۲۰	۱۹۷۲	میونخ (مغربی جرمنی)	۲۶/اگست - ۱۰/ستمبر	۱۸۳	۱۲۲	۷۱۵۶
۲۱	۱۹۷۶	مانٹریال (کینیڈا)	۱۷/جولائی - یکم اگست	۱۹۸	۹۲	۶۰۸۵
۲۲	۱۹۸۰	ماسکو (سوویت یونین)	۱۹/جولائی - ۳/اگست	۲۰۳	۸۱	۵۳۲۶
۲۳	۱۹۸۴	لاس اینجلس (امریکہ)	۲۸/جولائی - ۱۲/اگست	۲۲۱	۱۴۰	۷۰۷۸
۲۴	۱۹۸۸	سول (جنوبی کوریا)	۱۷/ستمبر - ۲/اکتوبر	—	—	—
۲۵	۱۹۹۲	بارسلونا (اسپین)	ابھی ان اولمپک کھیلوں کی تاریخوں کا تعین نہیں گیا۔			

۱۹۲۴ سے برف پر ہونے والے کھیلوں کے مقابلے اولمپک کے سال ہی علیحدہ سے کسی اور مقام پر منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان اولمپک کو "سرمائی اولمپک" کہا جاتا ہے۔

"سول اولمپک"۔ کھیلوں کے مقابلے، حصّہ لینے والی اقوام اور ان کے کھلاڑیوں کی تعداد ہر اعتبار سے اب تک ہونے والے تمام اولمپک سے بڑے اولمپک ثابت ہوں گے۔ توقع ہے کہ سول اولمپک میں ۱۶۱/ممالک کے ۸۹۸۲ کھلاڑی کھیلوں کے ۲۳۷/مقابلوں میں شرکت کریں گے جو اولمپک کا نیا ریکارڈ ہوگا۔

اس وقت آئی او سی کے ارکان کی کل تعداد ۱۶۷ ہے اور صرف ۶/ارکان ان اولمپک میں شرکت نہیں کر رہے۔ وہ چھ ممالک شمالی کوریا، کیوبا، ایتھوپیا، نکاراگوا، البانیہ اور سیشلز ہیں۔ شمالی کوریا چاہتا تھا کہ اس اولمپک کے آدھے کھیل اس کے دارالحکومت پیانگ یانگ میں ہوں اور ان اولمپک کو "پیانگ یانگ - سول اولمپک" کہا جائے لیکن آئی او سی نے شمالی کوریا کے یہ مطالبات نہیں مانے اور صرف پانچ کھیلوں کو شمالی کوریا میں منعقد کرنے کی اجازت دی جن میں تیراندازی، خواتین کے والی بال مقابلے، سائیکل ریس، ٹینس، اور فٹ بال کے چند میچ شامل تھے۔ آئی او سی نے یہ بھی کہا کہ یہ اولمپک صرف سول اولمپک کہلائیں گے۔ شمالی کوریا اب تک اپنے مطالبات پر سختی سے قائم ہے پہلے کئی ممالک نے شمالی کوریا کی حمایت میں سول اولمپک کے بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ دیگر ممالک شرکت پر راضی ہوگئے اب صرف چھ ممالک باقی رہ گئے ہیں لیکن وہ تمام شمالی کوریا کے حامی نہیں، اُن میں سے کئی رقم کی کمی کی وجہ سے شریک نہیں ہو رہے۔ واضح رہے کہ کوریا کے دو حصّے ہیں ایک شمالی کوریا اور دوسرا جنوبی کوریا۔ ایک زمانے تک کوریا صرف ایک ملک تھا۔ لیکن ۱۹۵۰ء کی جنگِ کوریا کے بعد اس کے دو حصّے ہوگئے اور اس وقت سے ان دونوں کے تعلقات خراب ہیں۔

جنوبی کوریا کے عوام نے سول اولمپک کی تیاریاں ۱۹۸۱ء سے شروع کیں اور وہاں کے محنتی اور جفاکش باشندوں نے وقت سے بہت پہلے تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔ ہزاروں افراد نے رات دن کام کر کے مختلف عمارتیں اور سڑکیں وغیرہ تعمیر کیں۔ یہ اولمپک سول اور اس کے قریب ۳۰ مختلف جگہوں پر ہوں گے۔ مرکزی اسٹیڈیم سول سے ۱۳/کلومیٹر دور واقع

ہے۔ اس کا نام سول اسپورٹس کامپلیکس ہے وہ چھ عمارتوں پر مشتمل ہے۔ ان چھ عمارتوں میں سے ایک اولمپک اسٹیڈیم ہے جہاں کھیلوں کی افتتاحی اور اختتامی تقاریب ہوں گی۔

سول اولمپک کی علامت MASCOT چیتے کے ایک بچّے کو قرار دیا گیا۔ اس کا نام ہوڈوری ہے۔ اسے ایک ٹوپی پہنے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ٹوپی سے جو پھریرا نکل رہا ہے وہ ہوا میں لہراتا ہوا انگریزی حرف "ایس" کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے "ایس" سول کو ظاہر کرتا ہے۔ علامت کے طور پر چیتے کے بچّے کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ کوریا کی تاریخ اور ادب میں چیتے کو بڑا خاص مقام حاصل ہے اور اسے وہاں خوش قسمتی اور برکت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

سول اولمپک کو کامیاب بنانے کے لیے جنوبی کوریا کے عوام نے اربوں روپے خرچ کیے ہیں لیکن ابھی اس کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ شمالی کوریا کے دہشت پسندوں کی طرف سے ہے جو کسی بھی وقت کوئی مشکل کھڑی کر سکتے ہیں لیکن اس سلسلے میں سخت حفاظتی انتظامات کیے گئے ہیں اور ہر طرح سے کوشش کی گئی ہے کہ بیرونِ ملک سے آنے والے لاکھوں سیاحوں اور کھلاڑیوں کی جانیں محفوظ رہیں۔

سول اولمپک ایک خواب تھا، اب اس کی تعبیر کا وقت آپہنچا ہے۔

دلچسپ اولمپک ریکارڈز

اولمپک کھیلوں کے دلچسپ اور ناقابلِ یقین واقعات

- اولمپک کھیلوں کی تاریخ میں سب سے کم عمر انعام یافتہ بچّے کا تعلق فرانس سے ہے۔ اس بچّے نے ۱۹۰۰ کے پیرس اولمپک میں شرکت کی تھی۔ بچّے کی عمر سات سے دس سال کے درمیان بتائی جاتی ہے لیکن تاریخ میں اس کا نام محفوظ نہیں۔ اس بچّے نے سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔

- ایک صاحب ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے ۶۴ برس ۲۵۸ دن کی عمر میں سونے کا تمغہ جیت کر سب سے زیادہ عمر میں اولمپک کھیلوں میں انعام حاصل کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ وہ صاحب سویڈن کے آسکر گومرسوا ہن تھے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں اپنے ملک میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں شوٹنگ کے مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والی ٹیم میں شامل تھے۔

- ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ٹوکیو اولمپک میں میراتھن دوڑ کا مقابلہ ہوا، جس کے متعلق اندازہ ہے کہ اُسے پانچ لاکھ سے پندرہ لاکھ افراد نے دیکھا۔ یہ کسی بھی کھیل میں ایک دن میں سب سے زیادہ افراد کی شرکت کا اولمپک ریکارڈ ہے۔ ایک

اولمپک کھیل کے دوران مجموعی طور پر سب سے زیادہ شائقین کی آمد کا ریکارڈ ۱۹۸۴ء کے لاس اینجلس اولمپک میں قائم ہوا۔ لاس اینجلس اولمپک کو دیکھنے والے شائقین کی کل تعداد ۵۸ لاکھ ۹۷ ہزار ۹ سو تیئیس تھی۔

○ اولمپک کھیلوں میں مجموعی طور پر سب سے زیادہ تمغے جیتنے والے کھلاڑی سویڈن کے مشہور زمانہ ایتھیلٹ پاآوڈ نرمی تھے۔ انہوں نے کل ۱۲ تمغے حاصل کیے جن میں سونے کے ۹ اور چاندی کے تین تمغے شامل تھے۔ ایک کھلاڑی ایسے بھی ہیں جو صرف ایک اولمپک میں سونے کے سات تمغے جیت چکے ہیں۔ وہ امریکہ کے مشہور پیراک مارک اسپٹز ہیں۔ انہوں نے یہ کارنامہ ۱۹۷۲ء کے میونخ اولمپک میں انجام دیا تھا۔

○ ڈنمارک کے ڈاکٹر آئی وان اوز بیٹر نے پہلی بار ۱۹۰۸ء کے لندن اولمپک میں کشتی رانی کے مقابلے میں حصہ لیا اور آخری بار ۱۹۴۸ء کے لندن اولمپک میں لندن سے لندن تک یوں تو کوئی فاصلہ نہیں لیکن اب دو اولمپک کھیلوں کے درمیان ۴۰ سال کا وقفہ حائل رہا یہ پہلے اور آخری اولمپک کے درمیان طویل وقفے کا ریکارڈ ہے۔

○ صرف پانچ ممالک ایسے ہیں جنھوں نے اب تک ہونے والے تمام اولمپک کھیلوں میں شرکت کی ہے۔ وہ ممالک آسٹریلیا فرانس، یونان، برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ ہیں۔ ان میں صرف برطانیہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے تمام سرمائی اولمپک کھیلوں میں بھی شرکت کی۔

○ باسکٹ بال کو ۱۹۳۶ء کے برلن اولمپک میں پہلی بار شامل کیا گیا تھا۔ اس وقت سے ۱۹۷۲ء تک امریکی ٹیم اولمپک کھیلوں میں ۶۳ مقابلے جیت کر نا قابلِ تسخیر تھی۔ ۱۹۷۲ء کے میونخ اولمپک میں سوویت یونین کی ٹیم نے امریکی ٹیم کو صرف ایک پوائنٹ سے شکست دے کر اس کی ۳۶ سالہ برتری کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۶۸ء تک ہونے والے آٹھوں اولمپک میں امریکی ٹیم نے کامیابی حاصل کی تھی۔ ۱۹۷۶ء کے مانٹریال اولمپک اور ۱۹۸۴ء کے لاس اینجلس اولمپک میں بھی میدان امریکی کھلاڑیوں کے ہاتھ رہا۔ ۱۹۸۰ء کے ماسکو اولمپک میں امریکی ٹیم نے شرکت نہیں کی تھی۔ کسی ایک کھیل میں اولمپک مقابلوں میں کسی اور ملک نے ایسی واضح برتری کا مظاہرہ نہیں کیا۔

خبرنامہ سول

سول اولمپک سے متعلق ایسی تازہ ترین خبریں
جن میں دلچسپی اور حیرت کا پہلو نمایاں ہے!

عبدالحفیظ نوری

● ایران نے سول اولمپک گیمز کی آرگنائزنگ کمیٹی سے کہا ہے کہ وہ اولمپکس کی افتتاحی واختتامی تقاریب کے لیے ایرانی قومی پرچم بردار کے طور پر کسی خاتون کی جگہ مرد کو نامزد کریں۔ کمیٹی نے ایران کی یہ درخواست قبول کر لی ہے۔ کمیٹی کے ترجمان کے مطابق ایران نے اسلامی مملکت ہونے کے ناطے یہ درخواست کی ہے۔ کیونکہ اسلام میں خواتین کا منی اسکرٹ پہننا جائز نہیں ہے۔ جب کہ پرچم بردار کے طور پر مقابلۂ حسن سے لڑکیاں منتخب کی گئی ہیں۔ واضح رہے کہ ۱۹۸۶ء کے ایشین گیمز میں بھی ایرانی پرچم ایک مرد نے اٹھا رکھا تھا۔

● امریکہ کا ایک بحری بیڑا ۴۵ ہزار ٹن وزنی جنگی جہاز "نیو جرسی" کی قیادت میں جنوبی کوریا کی بندرگاہ یوزان پہنچا۔ یہ ان امریکی افواج کا حصہ ہے جو سول اولمپک گیمز کے دوران جنوبی کوریا میں موجود رہیں گی۔ امریکی سیکرٹری دفاع فرینک کارلوچی کے مطابق امریکی افواج گیمز کے دوران کسی ممکنہ حملے

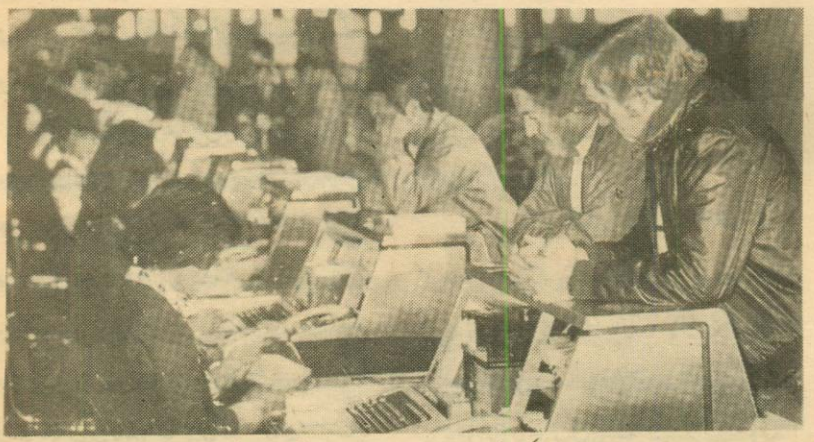

اولمپک کے دوران تازہ ترین معلومات فراہم کرنے کا مرکز

یا تخریب کاری سے نمٹنے کے لیے وہاں موجود رہیں گی۔

● سول اولمپک گیمز کے سائیکلنگ مقابلوں میں شرکت کرنے والے ۲۲ ممالک کے قومی پرچم جو سول میں سڑک کے اطراف کھمبوں پر لگائے گئے تھے، غائب کر دیے گئے ہیں۔ پولیس نے اس بارے میں کسی پر بھی شبہ ظاہر نہیں کیا ہے لیکن امکان اس بات کا ہے کہ جنوبی کوریا میں تعینات امریکی فوجیوں نے سوئینر کے طور پر یہ پرچم اتار لیے ہیں۔ مجموعی طور پر ۲۶ پرچم لاپتہ تھے۔ جن میں سے امریکہ، ایران، برطانیہ اور یوروگوئے کے پرچم بعد ازاں دریافت کر لیے گئے۔ اہم ممالک سائیکلنگ مقابلوں میں حصّہ لے رہے ہیں۔

● اولمپک کے دوران یہ بات یقینی ہے کہ سول کے بازار خریداروں کے ہجوم سے بھرے رہیں گے۔ کیونکہ دُنیا کی بیشتر مارکیٹوں کے مقابلے میں سول کے بازار سستے ثابت ہوں گے۔ مثال کے طور پر لوئیس ویٹن بیگ جو فرانسیسی ساختہ ہیں۔ ان کی دوسری جگہوں پر قیمت ۳۴۰ ڈالرز ہے جب کہ سول میں یہ صرف ۴۰ چالیس ڈالرز کے عوض دستیاب ہوں گے۔ اس طرح سول کے بازار خریداروں کی جنت بنے رہیں گے۔

● دُنیا بھر کے ٹیلی فون صارفین کو سول اولمپک گیمز کے دوران بین الاقوامی ٹیلی فون کال کی شرح پر مطلوبہ تازہ ترین معلومات فراہم کی جائیں گی۔ کوریا ٹیلی کمیونیکیشن ایسوسی ایشن ۲۴ گھنٹے کی سروس شروع کر رہی ہے۔ جس میں، کورین، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں طلب کرنے پر معلومات فراہم کی جائیں گی۔ اس سروس سے صرف ڈیجیٹل ٹیلی فون سیٹ رکھنے والے صارفین ہی فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ ہر کال ۳ منٹ پر محیط ہوگی۔ صارفین کو پہلے انٹرنیشنل کوڈ اور پھر جنوبی کوریا کا قومی کوڈ نمبر ڈائل کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ۲-۱۵۶ پر کوریائی زبان میں، ۲-۱۵۷ پر انگریزی اور ۲-۱۵۸ پر ڈائل کر کے فرانسیسی زبان میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

● اولمپک کھیل کے دوران اولمپک ولیج میں بال ترشوانے کی اجرت ادا کرنی ہوگی لیکن وہ فلموں اور سوئمنگ کا لطف مفت اُٹھا سکیں گے۔ اولمپک ولیج میں رہائش پذیر افراد کو ۲۳ مہیا کی جانے والی خدمات میں سے ۱۰ کی اُجرت ادا کرنی پڑے گی۔

● ۱۹۸۴ء کے لاس اینجلس اولمپکس کے ڈبل گولڈ میڈلسٹ چینی جمناسٹ لی ننگ اُن ایتھلٹس میں شامل ہے جو اپنے ملک کی طرف سے اولمپک مشعل لیے ریلے دوڑ میں حصّہ لیں گے۔ آرگنائزنگ کمیٹی نے اولمپک تحریک کے رکن ۱۶۷ ممالک سے درخواست کی ہے کہ وہ اس ریلے میں شرکت کے لیے اپنے ملک کی طرف سے ایک ایک ایتھلٹس کو نامزد کریں۔ جو شمالی سول سے شروع ہونے والے ۱۶۷، کلومیٹرز فاصلہ کے لیے مشعل لے کر چلیں گے۔ جب کہ مکمل ریلے ۲۲ روز پر محیط ہے۔ جس میں کوریا کے اطراف ۴ ہزار ایک سو ۶۳ کلومیٹرز کا فاصلہ طے کیا جائے گا۔

● سول اولمپک گیمز کے لیے جدید پنٹاتھلن مقابلوں کے سلسلے میں درآمد کردہ ۶۰ گھوڑوں میں سے ایک پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ ۶ سالہ گیلڈنگ جسے دیگر ۲۴ گھوڑوں کے ساتھ مغربی جرمنی سے درآمد کیا گیا تھا ۱۷ جولائی کو مر گیا۔ اس کی قیمت ۲۰ ہزار ڈالر تھی۔ باقی ۳۶

سول میں کھلاڑیوں کی حفاظت کے لیے کیے گئے سخت حفاظتی انتظامات

گھوڑے اٹلی سے درآمد کیے گئے ہیں۔ جدید پنٹا تھلن مقابلے میں گھڑسواری، شمشیر زنی، ۳۰۰ میٹر ز پیراکی شوٹنگ اور ۴ ہزار میٹرز کی کراس کنٹری دوڑ شامل ہے۔

• سول اولمپک گیمز آرگنائزنگ کمیٹی کے مطابق اولمپکس کی افتتاحی تقریب کے لیے ۷۰ ہزار نشستیں مختص کی گئی ہیں۔ جس کے لیے ۲۷ فیصد ٹکٹ مفت فراہم کیے گئے ہیں۔ اس طرح ۱۷ ہزار نشستیں ذرائع ابلاغ، اولمپکس میں شریک ممالک کے اسپورٹس کے حکام، ممتاز شخصیتوں اور پرفارمرز کے لیے مختص ہوں گی۔ جب کہ افتتاحی و اختتامی تقاریب کے لیے مزید ۴ ہزار ٹکٹ اسپانسرز کے لیے محفوظ رکھے گئے ہیں۔

• جنوبی کوریا کی حکومت اولمپکس کے لیے حفاظتی اقدامات کو مزید سخت بنانے کے لیے کاروں کی درآمد عارضی طور پر معطل کرنا چاہتی ہے۔ حکومت کے خیال میں دہشت گرد کاروں کے انجن میں اسلحہ اور آتش گیر دھماکہ خیز مادہ اسمگل کر سکتے ہیں۔

• اولمپک گیمز کے لیے سول آنے کے خواہشمند سیّاح آخری منٹ پر بھی ہوٹل میں کمرے حاصل کر سکیں گے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں تو بکنگ مکمل ہو چکی ہے۔ لیکن چھوٹے ہوٹل جنھیں یوگوان کہا جاتا ہے اور جو یورپ کے تھری اسٹار ہوٹلوں کے برابر ہیں۔ ان میں ۵ ہزار کمرے ابھی خالی ہیں۔ جب کہ مجموعی طور پر ۷ ہزار ۹ سو یوگوان ہوٹلوں کے کمرے خالی رکھے گئے ہیں۔ تاکہ تاخیر سے پہنچنے والوں کو رہائش کی سہولت مل سکے۔ ان کے علاوہ کوریا کے ۵۰۰ خاندان جو غیر ملکی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں وہ ۲۰ سے ۳۰ ڈالرز یومیہ کرایہ پر مہمانوں کو رہائشی سہولت فراہم کریں گے۔

ایک بار کی زحمت سال بھر کا آرام

گھر بیٹھے ہر ماہ حاصل کرنے کے لیے

آنکھ مچولی صرف ایک بار زحمت کیجیے۔

اور ۱۲ ماہ تک اپنا پسندیدہ رسالہ باقاعدگی سے حاصل کیجیے۔

آنکھ مچولی کے ۱۲ شماروں کی قیمت مع دو خاص نمبر اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ **۱۲۶** روپے بنتی ہے، لیکن خصوصی بچت اسکیم کے تحت آپ کو صرف **۹۰** روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں گویا بہ یک وقت آپ دو فائدے اُٹھا سکتے ہیں۔

(۱) **۳۶** روپے کی خصوصی بچت۔ (۲) گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے کی بحفاظت ترسیل۔

یاد رہے کہ رسالے کی قیمت میں اضافے کے باوجود زرِ سالانہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اگر آپ سالانہ خریداری کے لیے ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو **۹۰** روپے کا منی آرڈر اور مندرجہ ذیل کوائف ایک علیحدہ کاغذ پر روانہ کریں۔

① خریدار کا نام ② مکمّل پتہ ③ رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے ④ فون نمبر (اگر ہو) ⑤ دستخط

غیر ممالک کے لیے سالانہ شرحِ خریداری

۹ امریکی ڈالرز ۔ متحدہ عرب امارات، عمان، بحرین، قطر، دبئی، ایران، عراق، سعودی عرب، کویت، شام، ٹرکی، انڈونیشیا، بھارت، سنگاپور، فلپائن۔

۱۲ امریکی ڈالرز ۔ بنگلہ دیش، تھائی لینڈ، چین، جاپان، یونان، یوگوسلاویہ، زیمبیا، الجیریا، نائیجیریا، آسٹریا، اٹلی، کوریا، برطانیہ، مغربی جرمنی، ڈنمارک، ناروے، فرانس، بلجیم، اسپین، سویڈن، ہالینڈ، جنوبی افریقہ، تنزانیہ، کینیا، تیونس، سوڈان، مصر، یوگنڈا، گنی۔

۱۸ امریکی ڈالرز ۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، امریکہ، کینیڈا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، پاناما۔

خصوصی بچت اسکیم "ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی - ۱۱۳ - نورس روڈ سائٹ، کراچی ۱۶

مُنیب ضیاء

اولمپکیات

اولمپک سے متعلق عجیب، دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات

اوّل یا آخر

۱۹۰۴ء میں تیسرے اولمپک کھیل امریکہ کے شہر سینٹ لوئی میں ہوئے۔ میراتھن سب سے لمبی دوڑ ہوتی ہے۔ اس میں دوڑنے والے افراد کو ۲۶ میل ۳۸۵ گز کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس میراتھن میں حصّہ لینے والے کھلاڑیوں میں ایک امریکی ایتھلیٹ فریڈ لورز بھی تھے۔ وہ اُس لمبی دوڑ میں اولمپک اسٹیڈیم پہنچنے والے پہلے کھلاڑی تھے۔ امریکی عوام نے جب اپنے کھلاڑی کو کامیابی حاصل کرتے ہوئے دیکھا تو اُنہوں نے اُن کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ابھی دوسرے ایتھلیٹ ---لورز سے بہت پیچھے تھے۔ منتظمین نے تمغوں کی تقسیم کے انتظامات شروع کر دیے۔ کچھ دیر بعد دوسرے کھلاڑی اسٹیڈیم میں دوڑتے ہوئے داخل ہوئے اُن کے ساتھ ججز بھی تھے۔ انہوں نے آتے ہی لورز کی دھوکے بازی کے متعلق سب کو بتا دیا۔ اب تو تماشائیوں کا بُرا حال ہوگیا۔ کچھ دیر پہلے خوشی کے عالم میں زور زور سے تالیاں بجانے والوں پر اچانک سکتہ سا طاری ہوگیا۔ بعد میں پتا چلا کہ لورز سب سے آگے دوڑتے ہوئے تقریباً آدھے فاصلے پر پہنچ گئے تو انہوں نے سوچا کہ شدید گرمی میں کچھ دیر آرام کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس زمانے میں آج کی طرح کیمرے اور دوڑنے والوں کے ساتھ ساتھ چلنے والی گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ دیر آرام کے بعد وہ چُپ چاپ ایک کار میں بیٹھے اور جب اولمپک اسٹیڈیم پانچ میل دُور رہ گیا تو وہ کار سے اُترے اور انہوں نے دوبارہ دوڑنا شروع کر دیا۔ لیکن ججز کو اُن کی دھوکے بازی کا اُسی وقت پتہ چل گیا۔ چنانچہ اُن پر پوری زندگی کے لیے دوڑ میں حصّہ لینے پر پابندی لگا دی گئی۔

محنت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔

وہ بچپن میں پولیو کا شکار ہوگئے تھے۔ انھیں پیدل چلنے میں سخت مشکل ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے اُن سے کہا کہ اگر وہ ایک جگہ کھڑے ہو کر کودنے کی مشق کرتے رہیں تو کچھ عرصے بعد اُن کی ٹانگوں کی تکلیف ختم ہو جائے گی۔ وہ روزانہ کئی کئی گھنٹے اسی طرح مشق کرتے رہے، نہ صرف وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگئے بلکہ اُسی مشق کے نتیجے میں اُنھیں کھلاڑی بننے کا شوق ہُوا۔

وہ عظیم کھلاڑی بنے ۔ انہوں نے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۸ء تک کے اولمپک کھیلوں میں سونے کے کُل دس تمغے جیتے جو کہ ایک اولمپک ریکارڈ ہے ۔ اب آپ محنت کی عظمت ثابت کرنے والے انسان کا نام جاننا چاہیں گے ، وہ امریکہ کے مشہور اور عظیم ایتھلیٹ رے ایوری تھے ۔

۱۹۰۴ء کی اولمپک میراتھن دوڑ میں کیوبا کے ایک ایتھلیٹ فیلی کارواجال نے بھی حصّہ لیا ۔ وہ دوڑ میں سب سے آگے تھے ۔ اٹھارہ میل دوڑنے کے بعد انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ تازہ دم ہونے کے لیے کچھ دیر آرام کیا جائے اور کچھ کھا پی کر آگے بڑھا جائے ۔ انھوں نے خوب پیٹ بھر کر سیب کھائے اور کچھ دیر بعد پھر دوڑ میں شریک ہو گئے ۔ اچانک ان کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا ۔ وہ درد اتنا شدید تھا کہ اُن سے مزید دوڑا نہ گیا ۔ وہ دوڑ سے الگ ہو گئے ۔ بعد میں انھیں اپنی حماقت پر سخت غصّہ آیا ۔ اگر وہ سیب نہ کھاتے تو سونے کا تمغہ حاصل کرنے سے انھیں کوئی بھی نہ روک سکتا تھا ۔ انھوں نے جو سیب کھائے تھے وہ کچّے تھے ۔

انگریزی کہاوت ہے کہ ہر روز ایک سیب کھانے سے انسان ہمیشہ مرض سے دُور رہتا ہے ۔ یہ کہاوت اچھے سیب کے لیے ہے ، کچّے سیب کے لیے نہیں ۔

جیت کر بھی ہار گئے ۔

۱۹۶۴ء میں اولمپک کھیل پہلی مرتبہ برِاعظم ایشیا میں ہوئے ۔ اس بار اولمپک کا میزبان جاپان کا دارالحکومت ٹوکیو تھا ۔ جاپانی عوام کو اپنے کھلاڑیوں سے بہت امیدیں تھیں لیکن اُن کے اکثر کھلاڑی ناکام رہے ۔ اتنے میں میراتھن دوڑ کا مقابلہ شروع ہُوا ۔ جاپان کے لوگوں کو یقین تھا کہ اُن کے ایتھلیٹ کوکی چی سُوبُورایا اس دوڑ میں سونے کا تمغہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ۔ سُوبُورایا بھی اس دوڑ کو ہر قیمت پر جیتنا چاہتے تھے ، لیکن وہ اس دوڑ میں پہلے نمبر کے بجائے تیسرے نمبر پر آئے ۔ انھیں کانسی کا تمغہ دیا گیا ۔ تمام جاپانی قوم کے ساتھ خود سُوبُورایا کانسی کا تمغہ حاصل کرنے کے باوجود شدید مایوس تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ہاراکری کا فیصلہ کیا ۔ جاپان میں خودکشی کرنے کو عبادت سمجھا جاتا ہے اور اُسے ہاراکری کہتے ہیں ۔ سُوبُورایا نے خود کو مارنے سے پہلے ایک کاغذ پر یہ عبارت لکھی : " میں اپنی قوم سے شرمندہ ہوں کہ میں اُن کی ... خواہشات پر پورا نہیں اُتر سکا ۔

رستم و سہراب

۱۹۰۸ء کے لندن اولمپک میں جو دلچسپ واقعات پیش آئے اُن میں اولمپک کی تاریخ میں پہلی بار ایک باپ اور بیٹی کے تمغے جیتنے کا یادگار واقعہ بھی شامل تھا ۔ دونوں بہت اچھے تیر انداز تھے ۔ باپ کا نام ڈبلیو ڈُوڈ تھا اور بیٹی مس این ڈُوڈ تھیں باپ نے سونے کا تمغہ جیتا ، لیکن بیٹی نے کانسی کا ۔

منتخب لطائف

اور مزے دار کارٹونز کے

کھٹے میٹھے

لڑکا :- سر مجھے چھٹی دے دیں ۔میری امی کی حالت بہت خراب ہے ۔"

ٹیچر :- "اچھا ! ابھی تھوڑی دیر میں چلے جانا ۔"

لڑکا :- "مگر جناب میری امی باہر گیٹ پر دھوپ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہیں ۔"

سید جاوید حیدر شاہ، راولپنڈی

ڈرامہ نگار :- (ہمسائے سے) کیا آپ نے میرا نیا ڈرامہ پڑھا، جس میں میاں بیوی ہر وقت آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں ۔"

ہمسایہ :- "پڑھا تو نہیں البتہ آپ کے گھر اس ڈرامے کی مشق ہوتے روز دیکھتا ہوں ۔"

صائمہ ناز   مقام نامعلوم

ایک فقیر دوسرے فقیر سے بڑے دُکھ کے ساتھ کہہ رہا تھا :" میری قسمت خراب نکلی ۔ میرا بڑا لڑکا ناکارہ ثابت ہوا ۔ نہ وہ بھیک مانگتا ہے اور نہ گندے کپڑے پہنتا ہے ۔ کل صبح کہہ رہا تھا ۔ اسکول میں داخلہ لوں گا ۔"

معظم فاروق، ٹوبہ ٹیک سنگھ

جارج برنارڈ شا ایک ریستوران میں کھانا کھا رہے تھے ریستوران میں بجنے والے بینڈ کی بے سُری آواز سے عاجز آ کر انھوں نے بیرے کو بلایا اور پوچھا :" یہ بینڈ والے کوئی فرمائشی چیز بھی بجا سکتے ہیں یا نہیں ؟"

ویٹر :- "کیوں نہیں صاحب"

برنارڈ شا :- "پھر اُن سے جا کر عرض کریں کہ اب صرف بغلیں بجائیں ۔"   سہیل لالانی ــــــ سکھر

تو تمہارا آخری بال بھی ٹوٹ ہی گیا !

انعامی لطیفہ

استقبالیہ کلرک :۔ "جناب میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ ہمارے ہاں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں "

مسافر :۔ "اگر صدرِ پاکستان آجائیں تو کیا تم اُنھیں کمرہ دے دوگے ؟"

کلرک :۔ "ظاہر ہے' دے دیں گے "

مسافر :۔ "تو پھر تم مجھے اُن کا کمرہ دے دو۔ وہ نہیں آرہے ہیں "

سمیعہ انجم ۔ منڈی بہاؤالدین

ایک صاحب روزانہ ایک بھکاری کو ایک روپیہ دیتے تھے۔ کچھ دن بعد پچاس پیسے دینے لگے۔ ایک دن بھکاری نے پوچھا "کیا بات ہے، پہلے آپ ایک روپیہ دیتے تھے، پھر پچاس پیسے اور اب پچیس پیسے دیتے ہیں ۔ ؟"

وہ صاحب بولے۔ "میں شادی سے پہلے ایک روپیہ دیتا تھا۔ جب شادی ہوگئی تو پچاس پیسے دینے لگا۔ اور پھر جب میرے گھر بچہ ہوا تو میں تمہیں پچیس پیسے دینے لگا"، اس پر بھکاری بولا "تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ میرے ہی پیسوں سے گھر چلا رہے ہو"۔

راؤ محمد عاطف خان ـــــــ مارٹن کوارٹرز کراچی

ایک صاحب پہلی مرتبہ جہاز میں بیٹھے تھے۔ اور بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اسی خوشی میں وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے بولے۔ وہ دیکھو!... آدمی بالکل چیونٹیاں معلوم ہو رہے ہیں"
دوسرے صاحب بولے" ارے صاحب، کیا بات کر رہے ہیں ابھی تو جہاز اُڑا بھی نہیں ہے"

تجمل الیاس ـــــــ سمن آباد، لاہور

ماں :۔ (بیٹے سے) "بیٹا تمھارے ٹیچر نے شکایت کی ہے کہ تم کلاس میں باتیں کرتے ہو"

بچّہ :۔ "نہیں ماں! تم نے مجھے کبھی سوتے میں بولتے دیکھا ہے "

ریحان خالد ـــــــ بڑا بورڈ، کراچی

ایک انگریز سیاح پاکستان کے دورے پر آیا تو اپنے گائیڈ کے ہمراہ گھومتا ہوا ایک گاؤں میں جا پہنچا۔ گاؤں میں اُس نے دیواروں پر اُپلے تھپے دیکھے تو اُس نے گائیڈ سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"سر یہ گوبر ہے" گائیڈ نے جواب دیا۔

انگریز کافی دیر تک غور کرتا رہا اور پھر اُس نے بڑے تعجّب کے ساتھ گائیڈ سے کہا "اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ گوبر ہے تو مجھے بتاؤ کہ گائے آخر دیوار پر کیسے چڑھی ؟"

شازیہ فرحین ـــــــ ناظم آباد کراچی

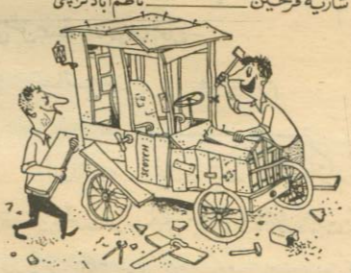

۔ بڑی مشکل سے بنتی ہے کار!

ایک مقرر کے ساتھ شام منائی گئی۔ تقریب کے آخر میں اُن کو بتایا گیا کہ لوگ اُن سے سوال کرنا چاہتے ہیں۔ مقرر نے کہا کہ لوگ کاغذ پر سوال لکھ کر بھیج دیں میں مائک پر اُن کے جوابات دے دُوں گا۔ کئی سوالوں کے بعد اُن کے پاس ایک پرچی آئی جس پر صرف "گدھا" لکھا ہوا تھا۔ مقرر نے معاملے کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"اب میرے پاس ایک ایسا کاغذ آیا ہے جس پر کسی صاحب نے اپنا نام تو لکھ دیا ہے، لیکن سوال لکھنا بھول گئے ہیں۔"

صولت رعنا ـــــ راولپنڈی

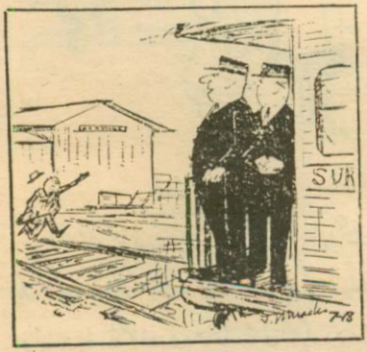

اسے ہمیشہ ہم سے شکایت رہتی تھی کہ ہم وقت پر نہیں آتے

ایک چھوٹا لڑکا ایک گھر کی گھنٹی تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک نیک دل بڑے میاں نے دیکھا تو جا کر گھنٹی کا بٹن دبا دیا اور بولے "لو صاحبزادے، تمہارے لیے اب کیا کروں؟"

لڑکا جلدی سے بولا "اب تیزی سے یہاں سے بھاگ جایئے ورنہ پٹائی ہو جائے گی۔"

سید یوسف شاکر ـــــ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

تانگے میں جُتتے ہوئے مریل سے گھوڑے کو دیکھ کر، جس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بادشاہ ہمایوں نے تانگے والے سے پوچھا: "دوست لگتا ہے تم گھوڑے سے بہت کام لیتے ہو۔" یہ سُن کر تانگے والے نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا "میں یومیہ بیس روپے کماتا ہوں، ہر شام قرعہ ڈالتا ہوں اگر قرعہ میرے نام نکل آئے تو روپوں سے میں نشہ خرید لیتا ہوں۔ اور اگر قرعہ اس کے نام نکل آئے تو اسے چارہ ڈال دیتا ہوں۔ بدقسمت دو ہفتوں سے قرعہ ہار رہا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

حمیرا بتول ـــــ اسلام آباد

پہاڑی کی ڈھلوان سے اُترتے ہوئے اچانک ٹیکسی کے بریک فیل ہو گئے۔ ڈرائیور نے گھبرا کر مسافر سے پوچھا "اب کیا کروں صاحب؟"

"کرائے کا میٹر بند کر دو۔" مسافر نے آرام سے جواب دیا۔

مزمل محمد ـــــ وھاڑی

مہمان: "میں نے کئی بار پوری دُنیا کی سیر کی ہے۔"

میزبان: "پھر تو آپ جغرافیے سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔؟"

مہمان: بے تکلفی سے "جی ہاں میں نے چار پانچ روز وہاں قیام کیا تھا۔ بڑا اچھا شہر ہے۔"

مُونا نازش ـــــ لاہور

ایک پولیس والا جس جگہ جاتا وہاں بات بے بات لوگوں کا چالان کرنا شروع کر دیتا۔ ایک مرتبہ اس کا تبادلہ ایک گاؤں میں ہُوا۔ گاؤں میں اُس نے تقریباً ہر شخص کا چالان کر ڈالا لیکن ایک بڑے میاں اُس کے شر سے محفوظ رہے۔ ایک روز جب

وہ بزرگ سائیکل پر سوار ہو کر پہاڑی کے راستے سے گھر آرہے تھے تو سپاہی موقع غنیمت جان کر ایک جھاڑی کے پیچھے جا چھپا۔ جُوں ہی بڑے میاں کی سائیکل جھاڑی کے پاس سے گزری، سپاہی نے اپنا پاؤں سڑک پر پھیلا دیا۔ بڑے میاں بچتے ہوئے دوسری طرف کو ہو گئے اور سائیکل روک کر بولے "بیٹا میں اکیلا نہیں ہوں، میرے ساتھ میرا خُدا ابھی ہے" سپاہی یہ سُنتے ہی بولا اب تو ڈبل سواری ہو گئی چالان ضرور ہو گا۔

جوّاد فیروز ـــــ نامعلوم

بس میں سوار ایک کنجوس کم کرایہ دینے پر مُصر تھا۔ وہ کنڈیکٹر سے جھگڑا کیے جا رہا تھا۔ کنڈیکٹر کو غصّہ آیا تو اُس نے کنجوس کا بکس اُٹھا کر بس سے باہر پھینکنا چاہا۔ کنڈیکٹر کے ارادے کو بھانپتے ہوئے کنجوس چلّاتے ہوئے بولا۔
"ایک تو زیادہ کرایہ مانگتے ہو اُس پر میرے بچے کو زخمی کرنا چاہتے ہو"

ابو اظہر محمود ـــــ جھیونراوالی

پہلا دوست "کیا تم نے اُس شخص کے بارے میں سُنا ہے جس نے دیوار کے آر پار دیکھنے والی چیز ایجاد کی تھی"
دوسرا دوست "نہیں، لیکن وہ کون سی چیز ہے جس سے دیوار کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے"
پہلا دوست "کھڑکی"

حسن مہدی خراسانی ـــــ کراچی

ایک دوست دوسرے دوست سے "تیری آنکھیں ہالی وُڈ کے مشہور اداکار گریگوری پیک سے ملتی ہیں"
دوسرا دوست "بھائی تمہاری ایک آنکھ دوسری آنکھ سے ہی نہیں ملتی تو گریگوری پیک سے کیا ملے گی؟"

ناصر خان ـــــ سکھر

دو دوستوں میں بہت پیار تھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ ساری زندگی ایک ساتھ رہتے ہوئے گزار دیں۔ اُن کی خواہش پوری ہوئی۔ اُنہیں عُمر قید کی سزا ہو گئی۔

عامر اعجاز ـــــ ضلع گجرات

ہائے میرا پاؤں!

ٹرین کے ڈبے میں دو عورتیں لڑ رہی تھیں۔ ایک کا کہنا تھا کہ کھڑکی کا شیشہ کھول دیا گیا تو اُسے نمونیا ہو جائے گا اور وہ مر جائے گی، جبکہ دوسری کا کہنا تھا کہ اگر شیشہ نہ کھولا گیا تو اس کا دَم گھُٹ جائے گا۔ معاملہ ٹکٹ چیکر تک جا پہنچا۔ ٹکٹ چیکر ابھی کوئی فیصلہ کرنے ہی والا تھا کہ ایک صاحب بول پڑے۔
"پہلے کھڑکی بند کر دی جائے تاکہ ایک عورت کا دَم گھُٹ جائے پھر کھڑکی کھول دی جائے، تاکہ دوسری کو نمونیا ہو جائے اور ہم سکون سے سفر کر سکیں" منیر احمد فاضل برڈوڈ روڈ، لاہور

اپنے دانتوں کو مزے سے صاف کیجئے

کرسٹل کے تین ذائقے تینوں مزے دار
کرسٹل ریڈ جیل میں چیری، گرین جیل میں
منٹ اور کرسٹل وہائٹ میں منٹ فریش۔

کرسٹل سے برش کیجئے، ٹوتھ پیسٹ کا مزا
لیجئے دانت ہمیشہ صاف، چمکدار اور کیڑا
لگنے سے محفوظ۔

Crystal

سانس خوشگوار، دانت چمکدار

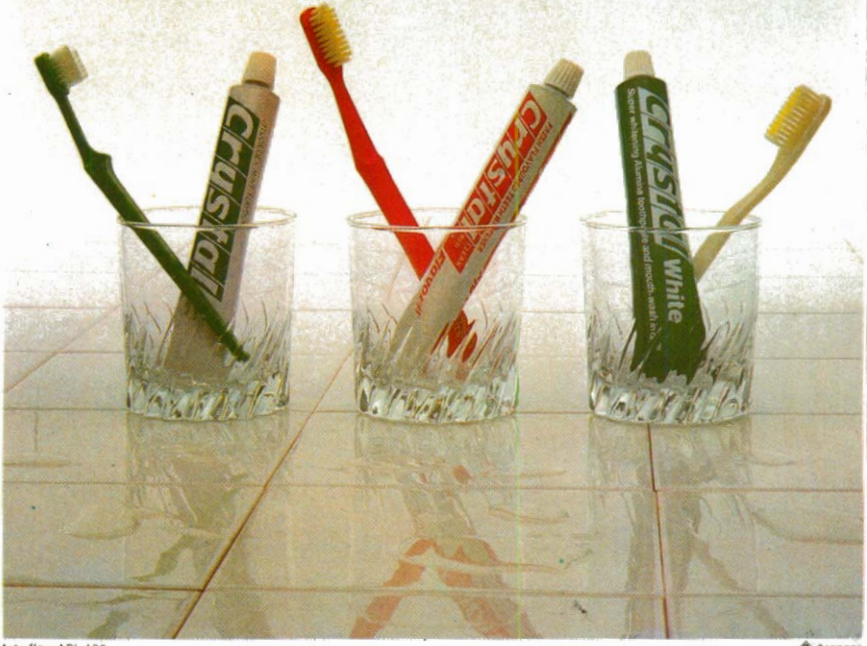

Interflow-APL-100

Scanned

جانوروں میں انسان کا رشتے دار ؟

محمد سلیم مُغل

چڑیا گھر کی سیر کرتے ہوئے آپ نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ سیاہی مائل بندر نُما مگر بندر سے قدرے بڑا یہ جانور انسانوں کے بعد دُنیا کی سب سے ذہین مخلوق کہلانے کا بجا طور پر مستحق ہے۔

ہمارے دوست احباب جب اس جانور کو چڑیا گھر کے پنجرے میں اُچھلتے کودتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بے انتہا خوش ہوتے ہیں، اس قدر خوش کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ یہ جانور یونہی اُچھلتا کودتا رہے۔ اس مقصد

کے لیے وہ اسے پتھر بھی مارتے ہیں۔ لکڑی، ٹہنیوں اور تنکوں کو اس کے جسم میں چبھوتے ہیں اور پھر اس کی تکلیف یا کلیف کے انداز اظہار کو دیکھ کر خوشی سے پھُولے نہیں سماتے۔۔۔ نہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے، چمپنزی ستائے جانے کے لیے نہیں سدھائے جانے کے لیے ہے، جانور اذیت کے نہیں آپ کے پیار کے مستحق ہیں اور پھر ایسا جانور تو اور بھی زیادہ توجہ چاہتا ہے جو اپنی ذہانت اور عادات میں انسان کے بہت قریب ہے۔

چمپنزی کو ہم اُردو میں بن مانس، بُوزنہ یا بے دُم کا بندر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا تعلق بندر ہی کے خاندان سے ہے مگر یہ عام بندر سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ چمپنزی کو ہم چمپنزی کیوں لکھ رہے ہیں، لنگور، بن مانس یا گوریلا کیوں نہیں لکھ رہے ہیں؟ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس نسل کے جانور بظاہر ایک سے ہونے کے باوجود ان کی بہت سی اقسام ہیں اور ہر قسم کا اپنا علیحدہ ایک نام ہے۔ ہمارے ہاں ان کا تصور نہ جانے کیوں خلط ملط ہو کر رہ گیا ہے اور ہم میں سے اکثر لوگ اسے بغیر جانے ہوئے لنگور یا بن مانس کہہ دیتے ہیں جب کہ انگریزی زبان میں اس نسل کی ہر قسم کا علیحدہ ایک نام ہے۔ انڈونیشیا کے جزائر سماٹرا اور بورنیو کا انسان صورت بندر بھی اپنی رنگت اور قد و قامت کے اعتبار سے چمپنزی سے ملتا جُلتا ہے لیکن اس کا نام ORANGOOTAN ہے۔ اسی طرح عام بندروں میں بھی سیاہی مائل بندر ہوتے ہیں۔ لوگ لاعلمی میں انہیں بھی لنگور یا بن مانس کہہ دیتے ہیں۔ یوں گویا ان مختلف قسم کے جانوروں کو آپس میں گڈمڈ کر دینے سے ان کے درمیان کوئی واضح فرق باقی نہیں رہتا۔

ہمارا موضوع صرف چمپنزی ہے جو وسطی افریقہ کے بارانی جنگلات RAIN FOREST میں پایا جاتا ہے۔ یہ بے دُم جانور سائنس دانوں کی تحقیق کا موضوع بنا ہُوا ہے۔ امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک میں ایک عرصے سے اس جانور پر تحقیق ہو رہی ہے اور سائنس دانوں نے بیشمار دلچسپ اور حیرت انگیز انکشافات کے ذریعہ اسے عادات و اطوار اور ذہانت کے معاملے میں انسان کے قریب ترین قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے آسانی سے سدھایا بھی جا سکتا ہے اور نہ صرف کھیل تماشوں میں بلکہ روزمرّہ کی زندگی میں ایسے بہت سے کام لیے جا سکتے ہیں جو کوئی بھی عام آدمی کر سکتا ہے۔ سائیکل چلانا، سواری کرنا، مختلف کرتب دکھانا تو چمپنزی کے لیے کوئی ایسا بڑا کام نہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ امریکہ کے بعض ماہرینِ حیوانات نے چمپنزی کو کھیتوں میں ٹریکٹر چلانا، فصلیں کاشت کرنے میں مدد دینا، مویشیوں کو چارہ ڈالنے، وزن اُٹھانے اور گھر کے اہم کاموں کے لیے بھی سدھا لیا ہے۔ گویا ایسے بہت سے کام جن کے لیے ہمیں ملازم رکھنا پڑتا ہے۔ وہ سب کام چمپنزی معمولی سی تربیت کے بعد بہ خوبی کر سکتا ہے۔ لندن کے ریجنٹ پارک زُو میں تو چمپنزی باقاعدہ ایک چائے پارٹی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس ٹی پارٹی میں چائے بنانے سے لے کر چائے پینے اور پلانے تک سب کام چمپنزی آپس میں مل جُل کر کرتے ہیں۔ چائے پیتے

ہوئے تمام چمپنزی نہ صرف اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ احتیاطاً پنکن بھی باندھ لیتے ہیں کہ مبادا چائے گرنے سے کپڑے خراب نہ ہو جائیں۔ یہ بات ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ چمپنزی زیادہ تر وسطی افریقہ کے ان خود رو جنگلات میں پایا جاتا ہے جنہیں آئے دنوں کی بارشیں سیراب کرتی ہیں۔ درخت اس کا مسکن ہیں۔ درختوں پر ٹہنیوں اور گھاس پھوس کی مدد سے اپنے رہنے کے لیے اپنا آشیانہ خود تعمیر کرتا ہے۔ اس کا قد عموماً ۳ سے ۵½ فٹ تک ہوتا ہے۔ اس کے بازو اس کی ٹانگوں کے مقابلے میں لمبے ہوتے ہیں۔ چمپنزی عموماً اپنے دونوں بازوؤں اور دونوں ٹانگوں کی مدد سے چلتا ہے، لیکن کم فاصلے کے لیے انسانوں کی طرح صرف ٹانگوں پر بھی چل سکتا ہے۔ ایسا عموماً اُس وقت ہوتا ہے جب اُس نے ہاتھوں میں کوئی چیز اُٹھا رکھی ہو۔ ماہرین نے چمپنزی کو ایک ہاتھ میں کوئی چیز اٹھائے ہوئے دو ٹانگوں اور ایک بازو کی مدد سے بھاگتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

چمپنزی انسان کی طرح ایک قبیلہ یا خاندان کی شکل میں رہتا ہے۔ ایک قبیلہ عموماً چالیس سے پچاس خاندانوں پر

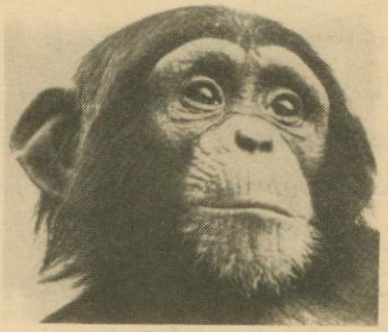

تشویش

حیرت

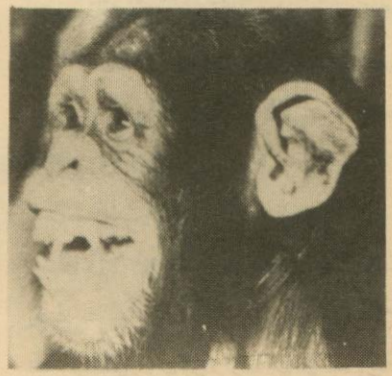

خوشی

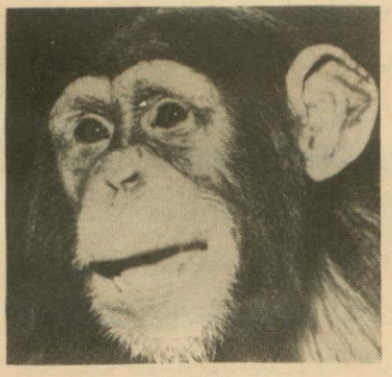

غصہ

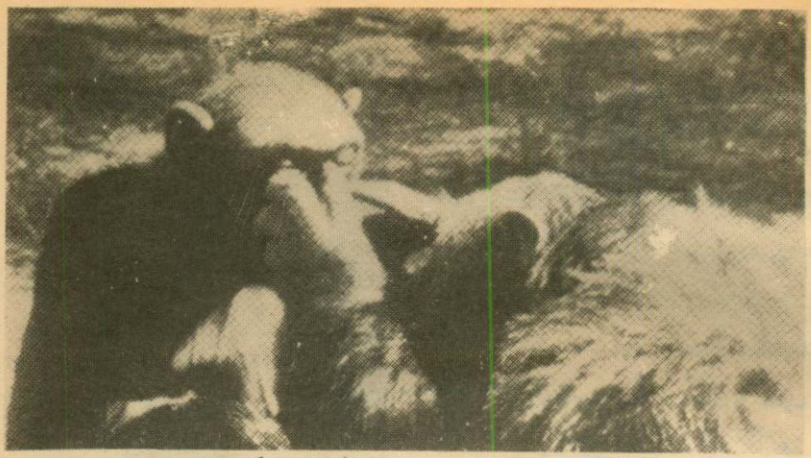

فوری طبی امداد کا عملی مظاہرہ - ساتھی کی آنکھ سے کچھ نکالتے ہوئے۔

مشتمل ہوتا ہے جبکہ ایک خاندان میں تین سے چھ ممبر ہوتے ہیں جو اکثر ساتھ چلتے ہیں۔ چمپنزی کی خوراک عموماً پھل، پھول پتے، جڑیں اور سبزیاں ہوتی ہیں۔ لیکن اگر بھوک شدید ہو تو کیڑے مکوڑے، پرندے اور چھوٹے جانور بھی کھا لیتا ہے پھلوں میں کیلا چمپنزی کی پسندیدہ اور مرغوب غذا ہے۔ ایک بڑا چمپنزی ایک وقت میں پچاس کیلے باآسانی کھا لیتا ہے۔ پسندیدہ چیزیں دستیاب نہ ہوں تو گھونسلوں سے انڈے بچے بھی اُٹھا لیتا ہے۔ بلکہ شدید بھوک میں تو چھوٹے بندر یا بندر کے بچوں کو بھی کھا لیتا ہے۔

ایک امریکی ماہر حیوانیات نے اپنے مشاہدے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چمپنزی نے پہلے بندر کے بچے کو پکڑا پھر پچھلی ٹانگوں سے اُوپر اٹھا کر سر کے بل زمین پر پٹخا اور اُسے مارنے کے بعد اُسے کھا لیا۔

ممکن ہے بندر کو مار کر کھانے کا یہ انداز آپ کو اچھا نہ لگا ہو، مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جاندار کو دوسرے جاندار کی غذا بنایا ہے اور دُنیا بھر کا غذائی نظام اسی اصول کے تحت کام کر رہا ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ تہذیب و تمدن نے انسان کو شائستگی سکھا دی ہے اور جانور بے چارے جانور ہونے کی وجہ سے اپنے کام خوش اسلوبی سے نہیں کر پاتے۔

چمپنزی کھانے کھاتے ہوئے خوب شور مچاتے ہیں یہ شور خوشی کی علامت بھی ہوتا ہے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو کھانے پر مدعو کرنے کا اشارہ بھی۔ چمپنزی آپس میں ہاتھ پھیلا کر کھانا مانگتے بھی دیکھے گئے ہیں۔ گویا ان میں دوسرے جانوروں کی طرح چھینا جھپٹی نہیں ہوتی بلکہ کھانے کے معاملے میں کسی قدر تہذیب و شائستگی نظر آتی ہے۔

یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے کہ عادات و اطوار میں چمپنزی انسان کے بہت قریب ہے۔ وہ کون سی باتیں ہیں جو اسے انسان کے قریب ترین ثابت کرتی ہیں۔ آیئے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے محبت

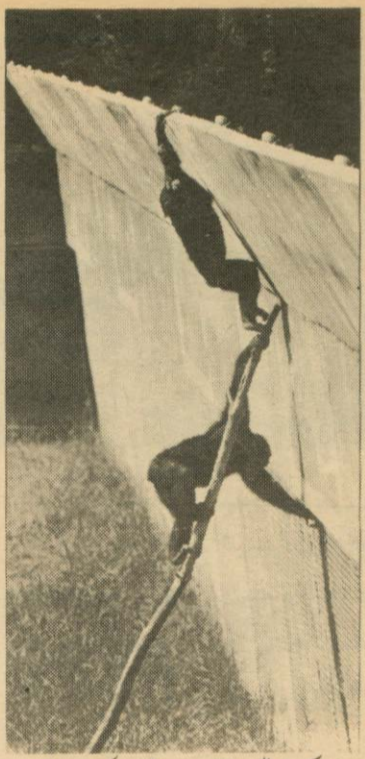

ذہانت کے اعلیٰ مثال رہائی پانے کی تدبیر

کرتا ہے اور خصوصاً جب کوئی بچھڑا ہوا دوست یا کوئی عزیز کافی دنوں بعد ملتا ہے تو انسان اپنی گرم جوشی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دو دوست آپس میں ملتے ہیں تو مصافحہ کرتے ہیں۔ بغل گیر ہوتے ہیں اور اپنے چہروں سے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ دو چمپنزی بھی اگر کافی عرصے بعد ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو خوشی کے اظہار کے طور پر سے ایک دوسرے کے بدن کو چھوتے ہیں۔ مصافحہ کرتے ہیں یا ایک دوسرے کے چہروں پر پیار کرتے ہیں۔ یہ بات محققین کے مطالعے اور مشاہدے کے حوالے سے مستند ہے۔ انسان مختلف کیفیات کا مجموعہ ہے۔ اسے غصہ بھی آتا ہے، پیار بھی، وہ فکر مند بھی ہوتا ہے اور خوف زدہ بھی، اِن تمام کیفیات کا اظہار انسان کے چہرے سے ہو سکتا ہے۔ یہی صورت چمپنزی کی بھی ہے۔ وہ بھی ان تمام کیفیات سے گزرتا ہے اور یہ کیفیات اُس کے چہرے سے عیاں ہوتی ہیں۔ انسان کی طرح ایک ہی جنس کے دو چمپنزی بسا اوقات طویل مدت کے لیے ایک دوسرے کے بہت گہرے اور اکثر ساتھ رہنے والے دوست بھی ہو سکتے ہیں

خوشی کے عالم میں چمپنزی کو شور مچاتے، اُچھلتے کُودتے اور پیر پٹختے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ جبکہ خوف کے عالم میں ایک چمپنزی دوسرے چمپنزی کے بازو کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بھی نظر آیا ہے۔

چمپنزی بہترین مددگار اور مشکل گھڑی میں اپنے ساتھیوں کا بہترین دوست ثابت ہوا ہے۔

ایک امریکی فوٹوگرافر عین اُس وقت چمپنزی کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو گیا جب ایک چمپنزی دوسرے کی آنکھ سے کوئی چیز نکال رہا تھا۔ فوٹوگرافر نے اس دلچسپ لمحے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایک چمپنزی کی آنکھ میں جب کوئی چیز گر گئی اور اُسے تکلیف ہوئی تو دوسرے نے کسی تجربہ کار ڈاکٹر کی طرح پہلے اُسے اپنے سامنے بٹھایا پھر اُس کے منہ کو اپنے منہ کے سامنے کیا۔ اور اپنی دونوں انگلیوں سے اس کی آنکھیں کھولیں اور بڑی نفاست سے آنکھ میں پڑی ہوئی چیز کو آنکھ سے باہر نکال دیا"۔ یہ مثال چمپنزی کو بہترین طبی مددگار بھی ثابت کرتی ہے۔

چمپنزی انسان کے بعد اوزار استعمال کرنے والی

چمپینزی کھیتوں میں مویشیوں کو چارہ ڈالتے ہوئے

ذہین ترین مخلوق ہے۔ یقیناً ان کے پاس اوزاروں کی وہ اقسام تو نہیں ہوسکتیں جو انسان ایجاد کر چکا ہے۔ لیکن زمانہ قدیم کے انسان کی طرح چمپینزی لکڑی، پتھر، نوکیلی اور تیز دھار والی چیزوں کے عملی استعمال کا پورا شعور رکھتا ہے۔ اپنے علاقے سے ناپسندیدہ جانوروں کو ڈنڈے کے ذریعہ بھگاتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ اسی طرح تنکوں اور لکڑی کی مدد سے بلوں کے اندر سے کیڑے مکوڑے نکالنے کا مشاہدہ بھی محققین کر چکے ہیں۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ چمپینزی اپنا ایک سماجی نظام بھی رکھتے ہیں، جس میں بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت، ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا شامل ہیں۔ اس نظام میں نر چمپینزی کو مادہ چمپینزی پر برتری حاصل ہے جو فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ یہ سماجی مرتبہ کسی نر چمپینزی کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ بڑا ہو کر مضبوط جسم کا مالک ہو اور ماں کے تحفظ سے آزاد ہو جائے۔ نر چمپینزی کے سماجی مرتبے کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ وہ مادہ اور بچوں کی موجودگی میں شور مچاتا ہے، ٹہنیوں پر جھولتا ہے، زمین پر پاؤں پٹختا ہے، لیکن کم عمر چمپینزی اس کے سامنے اُس کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ ان کی آوازوں کا نظام بھی بڑا عجیب ہے۔ چمپینزی کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں دو میل کے فاصلے تک سُنی جا سکتی ہیں۔ یہ آوازیں یقیناً معنی خیز ہوتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ چمپینزی ان آوازوں سے پیغام کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔

مادہ چمپینزی ۲۳۰ دنوں میں بچے کو جنم دیتی ہے۔ بچے جوڑے کی شکل میں بھی ہوتے ہیں مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد پہلے تو ماں بوکھلا

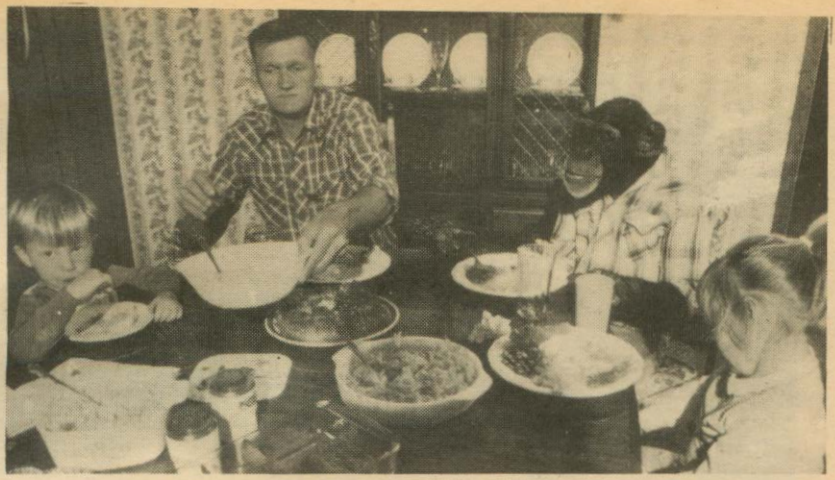

چمپینزی سے اہلِ خانہ کے ساتھ کھانا کھلتے ہوئے

ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہیں۔ چمپنزی بچے فرمانبردار ہوتے ہیں اور عموماً ماؤں کو تنگ نہیں کرتے۔ ابتدائی عمر میں تو بچے ہر وقت ماں کے ساتھ رہتے ہیں، لیکن بعد میں بھی بچے زیادہ وقت کے لیے ماں سے جُدا نہیں ہوتے۔

حالتِ قید میں چمپنزی کی عمر ۳۰ سے ۳۵ سال تک جاتی ہے کہ وہ کیا کرے لیکن پھر آہستہ آہستہ فطرت اُس کی تربیت کرتی ہے اور وہ بچے کی حفاظت اور پرورش کے لیے پوری مامتا کے ساتھ بچے کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ بعض مائیں تو آئیڈیل ہوتی ہیں۔ وہ بچے کو اپنے جسم اور بالوں سے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ انھیں اُٹھا کر پیار کرتی ہیں، ان کی خوراک انھیں پہنچاتی ہیں۔ بعض لاپرواہ مائیں بھی مشاہدے میں آئی ہیں۔ جو اپنی غفلت سے اپنے بچوں کو مارنے کا باعث بنتی ہیں۔ چمپنزی مائیں اپنے بچوں کو تین سے چار سال تک اُٹھاتے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔ جبکہ ۶ اور ۷ سال کی عمر تک کے بچوں کو مائیں اپنے ہوں تب بھی آزاد رہنے والے چمپنزی نسبتاً زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔

چمپنزی سے انسانی رویوں کی اتنی اہم مماثلت کے باوجود انسان کا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور چمپنزی بے چارہ ایک جانور لیکن علم کی دنیا کے اُٹھائے ہوئے دو سوال انسان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان میں پہلا سوال تو ڈارون کا وہ نظریہ ہے جس کے مطابق "انسان بندر یا بن مانس کی اصلاح شدہ شکل ہے"۔ سائنس کے اس نظریئے کو دنیا کے اکثر سائنسدانوں نے رد کر دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس مخلوق سے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سوچ اور فکر کے بہت سی نئی راہوں کو کھول دیتا ہے کہ

"وہ جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اُن کا
غضب ٹوٹا، اور جن میں سے بندر اور سؤر
بنائے گئے۔" (آیت نمبر ۶۰۔ سورۃ مائدہ)

ایک ننھی پری کی خواہش

میرزا ادیب

یہ نیلا آسماں کیا ہے، یہ کیا ہیں چاند اور تارے
یہ جھیلیں اور یہ چشمے، یہ دریا اور یہ نظارے

یہ ننھی منّی کلیاں جو چٹک کر پھول بنتی ہیں
یہ کرنیں چاند کی جو روشنی کا جال بُنتی ہیں

یہ رنگیں تتلیاں جو اُڑتی پھرتی ہیں فضاؤں میں
یہ رنگا رنگ بادل جو کہ چھائے ہیں ہواؤں میں

یہ ندی جو ہمیشہ میٹھے میٹھے گیت گاتی ہے
جو میدانوں میں بہتی ہے جو کہساروں سے آتی ہے

یہ جگنو جس سے رہتا ہے میرا ننھا سا گھر روشن
یہ سورج جو کیا کرتا ہے ہر دیوار و در روشن

یہ سب کیا ہے مجھے معلوم ہے پھر بھی نہ جانے کیوں
میرے دل میں ہے رہتی ایک خواہش سی نجانے کیوں

یہ خواہش ہے کہ ہر شے کی حقیقت میں سمجھ جاؤں
ہر اک منظر کی ہے جو اصل حالت میں سمجھ جاؤں

یہ کیا ہے اور کیسی ہے نہیں معلوم یہ مجھ کو
کہاں سے آتی ہے ہر شے نہیں معلوم یہ مجھ کو

یہ پریوں کا جزیرہ جس کی ہر اک چیز پیاری ہے
یہاں سے نیلے پربت تک یہ گل دُنیا ہماری ہے

جہاں چاہیں وہاں اُڑ کر پہنچ جاتی ہیں ہم پریاں
اِدھر جاتی ہیں ہم پریاں، اُدھر جاتی ہیں ہم پریاں

یہ سب کچھ ٹھیک ہے پر دل میں اک خواہش کھٹکتی ہے
حقیقت کیا ہے ہر شے کی یہی اُلجھن سی رہتی ہے

بے شک آنے والا وقت تمہارے لئے بہتر ہے اس وقت سے جو گزر چکا
اور بے شک تمہارا رب ایسی نعمتوں سے تم کو نوازے گا جو تم کو خوش کر دیگی۔

یہ الفاظ مبارکہ جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب
فرمائے، تمام سچے مسلمانوں کیلئے طمانیت کا پہلو رکھتے ہیں۔
آیئے ہم اللہ تعالےٰ کے حضور میں سر جھکا کر ان رحمتوں کا شکر
بجا لائیں جو اُمتِ مسلمہ پر اب سے پہلے ہوتی رہیں اور عہد کریں کہ
آئندہ اور زیادہ عنایات کا مستحق بننے کی کوشش کرینگے۔
ایک فریضہ جو ہم پر عائد ہوتا ہے، نظام اسلام کی تعمیر ہے۔
جو بفضلہٖ تعالیٰ پاکستان میں شکل پذیر ہو رہا ہے۔
نیشنل بینک اس مبارک مہم میں حسبِ توفیق شریک رہے گا۔

نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی قومی بینک

United

PID-I-19/85

عنکبوت وڈیو سنٹر

اخلاق احمد

حق اسکواڈ کے ارکان اسکول کی چھٹیاں ختم ہونے پر جب آپس میں ملے تو ایک دوسرے کو بتایا کہ انھوں نے اپنی چھٹیاں کہاں گزاریں۔
گفتگو کے دوران شہریار نے دوستوں کو اپنے ماموں زاد بھائی کے بارے میں بتایا جو وی سی آر پر بھارتی اور انگریزی فلمیں دیکھنے کا دیوانہ تھا۔ اس نے انھیں وی سی آر کے نقصانات سے آگاہ کرنے کے بعد بتایا کہ ان کے علاقے میں بھی ایک نئی دکان کا افتتاح ہونے والا ہے۔ انہوں نے طے کیا کہ ر رہنی چاہیئے۔ وہ سیدھے وڈیو شاپ پہنچے جہاں گاہکوں کا ہجوم جمع تھا۔ حق اسکواڈ کے ارکان نے دکان کے مالک کو سمجھانا چاہا تو وہ آپے سے باہر س کو ان کی پٹائی کے لیے آواز دی۔ ضیاء، شہزاد اور سرفراز تو غنڈوں سے بچ کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے مگر شہریار کو دکان کے مالک گولو سیٹھ نے پکڑ لیا۔

شہریار نے دیکھا کہ وہ دونوں غنڈے بھی اس کی طرف بڑھ رہے ہیں - اب آپ آگے پڑھیے۔

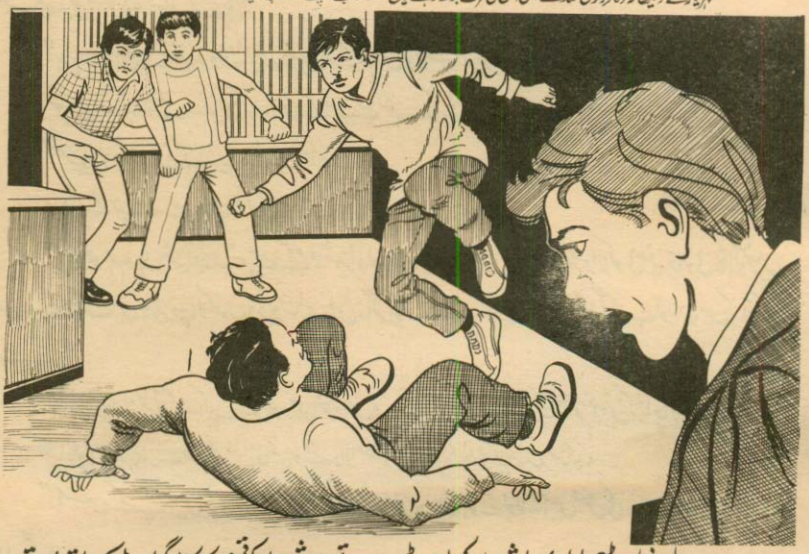

سیاہ فام ڈھولو اور بھولو شہریار کی طرف بڑھ رہے تھے اور شہریار کی قمیص کا کالر گولو سیٹھ کے ہاتھ میں تھا۔
خطرہ قریب آتا جا رہا تھا۔
شہریار نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ کراٹے کا کوئی داؤ آزمانے کا وقت آ گیا تھا۔
وہ اچانک اُچھلا اور گولو سیٹھ، ڈھولو اور بھولو نے حیرت سے اُسے فضا میں قلابازی کھاتے دیکھا۔ ابھی ان کی حیرت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ شہریار کی لات گولو سیٹھ کے ڈھول جیسے پیٹ پر پڑی۔ وہ ڈکرایا اور شہریار کی قمیص کا کالر

چھوڑ کر پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ باقی لوگ کچھ سمجھ پاتے، شہریار جھکا اور سامنے کھڑے ڈھولو کی ٹانگوں کے درمیان سے تیر کی طرح نکل گیا۔ ویڈیو فلمیں لینے والے ہجوم کو چیر کر باہر نکلنا بہت آسان کام تھا۔ شہریار نے فرار ہوتے وقت گولو سیٹھ، بھولو اور ڈھولو کی آوازیں سنیں۔ وہ چیخ چیخ کر اسے رُکنے کو کہہ رہے تھے۔ مگر وہ آگے نکلتا گیا۔

"ہیڈ کوارٹر" میں سب ہی شہریار کے منتظر تھے۔

"بہت خوب۔" شہریار نے دری پر بیٹھ کر سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میرے بہادر ساتھی مجھے وہاں پریشانی میں گرفتار چھوڑ کر چلے آئے۔ بہت خوب!"

سرفراز نے کہا۔ "ہم تو خوش تھے کہ تمھیں اب تک پولیس والے تھانے لے جا چکے ہوں گے اور اب چند مہینے تک تمھاری شکل نظر نہیں آئے گی۔"

"یہ بات نہیں۔" ضیاء بولا۔ "ہمیں یقین تھا کہ تم اس گولو سیٹھ کو کراٹے کا ایک آدھ ہاتھ رسید کر کے ہی آؤ گے۔"

شہریار نے کہا۔ "میں نے یہی کیا۔ اس کے منہ سے بکرے کی سی آواز نکلی تھی۔"

"مگر یار۔" شہزاد نے کہا۔ "یہ بات ہے غلط۔"

سرفراز نے حیرت سے پوچھا۔ "کون سی بات؟"

"یہی جو ہم وہاں منہ اُٹھائے چلے گئے۔" شہزاد بولا۔ "دیکھو نا۔ آخر وہ وڈیو سینٹر والا کوئی غیر قانونی کام تو نہیں کر رہا ہے۔ ملک میں ہزاروں لاکھوں وڈیو شاپس ہیں۔ اگر ایک ہمارے علاقے میں بھی کھل گئی ہے تو اس میں کیا غیر قانونی بات ہے؟"

شہریار بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں خود اس معاملے کو لوں مار پیٹ کر کے ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

ضیاء بولا۔ "پھر ہمارے علاقے میں قائم ہونے والا غیر قانونی وڈیو سینٹر کیسے بند ہوگا؟"

"اس کے لیے ہمیں بڑی محنت کرنی ہوگی۔" شہریار سوچتے ہوئے بولا۔ "ہمیں عقل کی مدد سے معاملات سلجھانے ہوں گے۔"

سرفراز مسکرایا۔ "تم معاملات کو عقل کی مدد سے کیسے سلجھاؤ گے۔ عقل کہاں ہے تمھارے پاس؟"

"عقل ہو یا نہ ہو۔" شہریار نے کہا۔ "میرے پاس ایک منصوبہ ضرور ہے۔"

وہ چاروں آگے جھک آئے۔

شہریار اپنا منصوبہ سناتا رہا۔

اور باقی تینوں اسے غور سے سُنتے رہے۔

اگلے ہی روز شہریار نے اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملاقات کی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب پہلے ہی حق اسکواڈ کے کارناموں سے واقف تھے۔ ایک دو مرتبہ تو وہ حق اسکواڈ کی مدد بھی کر چکے تھے۔

شہریار کی پوری بات سُن کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا: "ٹھیک ہے بھئی۔ ہم جس حد تک تمھاری مدد کر سکیں گے، کریں گے۔ کئی لوگ ایسے ہیں جو اسکول کو اکثر عطیات وغیرہ دیتے رہتے ہیں۔ میں ان سے تمھیں ملوا دوں گا۔ شاید وہ لوگ حق اسکواڈ کی بھرپور مدد کر سکیں۔"

اس بات کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔

ایک صبح گولو سیٹھ "عنکبوت وڈیو سینٹر" کھولنے کے پہنچا تو اسے دکان کے عین سامنے والے خالی میدان میں کچھ لوگ کام کرتے نظر آئے۔

یہ میدان بہت عرصے سے بنجر اور ویران پڑا ہوا تھا۔ شاید اسے پارک بنانے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا لیکن توجہ نہ ملنے کی وجہ سے ویران اور بنجر ہو گیا تھا۔

اگلے روز گولو سیٹھ نے اسی جگہ۔ عنکبوت وڈیو سینٹر کے بالکل سامنے۔ اسی طرح لوگوں کو اس میدان میں کام کرتے دیکھا۔ غور سے دیکھنے پر اسے محسوس ہوا کہ یہ لوگ میدان کھود رہے ہیں۔ کیاریاں بنا رہے ہیں اور زمین کو پانی دے رہے ہیں۔ کچھ دیر وہ انھیں غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اپنے کاروبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مگر تیسرے دن اسے پھر سامنے والے میدان کی طرف توجہ دینی پڑی۔ وہاں لوگ اسی طرح کام کر رہے تھے۔ کام کرنے والوں میں اسے وہ چاروں لڑکے بھی نظر آئے جو کچھ عرصہ قبل اس کی دکان میں آئے تھے۔ اور ہلکا پھلکا سا ہنگامہ کر کے فرار ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی گولو سیٹھ کو شدید غصہ آیا۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی جائے اور اس لڑکے کی تو ٹھکائی کر ہی دے جو اس دن اس کے پیٹ پر لات مار کر فرار ہوا تھا۔ مگر پھر اس نے کچھ سوچ کر اپنے غصہ پر قابو پا لیا۔ ان لڑکوں سے خواہ مخواہ دشمنی بڑھانا مناسب نہیں تھا۔

لیکن نہ جانے کیوں اسے بے اطمینانی سی ہو رہی تھی۔ خطرے کا احساس اسے خواہ مخواہ پریشان کر رہا تھا۔

اور بالآخر ایک ہفتے بعد جب وہ اسی طرح ایک صبح اپنی دکان کھولنے پہنچا تو اسے سخت حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

میدان میں اب گھاس اُگ آئی تھی۔ میدان کا ایک بہت بڑا حصہ اب سرسبز و شاداب نظر آ رہا تھا۔

لیکن حیرت کی بات محض گھاس کا اُگ آنا نہیں تھا۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہاں قسم قسم کے جھولے لگائے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے جھولے، چھوٹے بچوں کے لیے پھسلنے والا جھولا، بڑے بچوں کے لیے نت نئے کھیل۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں اب ایک بڑا سا سفید بورڈ جگمگا رہا تھا۔ جس پر گہرے نیلے رنگ سے لکھا ہوا تھا "حق اسکواڈ پارک"۔

اسی شام اس پارک کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔

علاقے کے کونسلر اور معززین افتتاحی تقریب میں آئے تھے۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کونسلر صاحب نے کہا: "حق اسکواڈ کے یہ نوجوان ہمارے پاس اس پارک کو نئے سرے سے بنانے سنوارنے کی تجویز لے کر آئے تھے۔ ان لڑکوں کی ہمت قابلِ داد ہے۔ ہم نے بھی ان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھا۔ یہاں بچوں کو کھیل کود کا سامان فراہم کرنے میں ہمارے ساتھ کئی صاحبِ حیثیت لوگوں نے تعاون کیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس تقریب کے اصل دولہا یہی چاروں نوعمر لڑکے ہیں۔ میں انھیں مبارک باد دیتا ہوں۔"

تقریب جب ختم ہو گئی تو سارے علاقے کے نوعمر لڑکے لڑکیاں پارک میں داخل ہو گئے۔

ان میں چھوٹے بچے بھی تھے، تتلا کر بولنے والے، سنبھل سنبھل کر چلنے والے بچے۔ اور نسبتاً بڑے بچے بھی تھے۔

شہریار، سرفراز، ضیاء اور شہزاد کے ہم عمر بھی۔

حق اسکواڈ کی یہ ترکیب نہایت کارگر، انتہائی کامیاب رہی۔

پارک کے بالکل سامنے "عنکبوت وڈیو سینٹر" میں آج ہجوم نہیں تھا۔ لڑکے فلمیں لے جانے کے بجائے "حق اسکواڈ پارک" میں طرح طرح کے کھیلوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"عنکبوت وڈیو سینٹر" کے سامنے وہی موٹا شخص ہمیشہ کی طرح آج بھی چیخ رہا تھا: "آیئے آپا۔ آیئے باجی۔ تازہ فلمیں۔ اچھی فلمیں، پانچ روپے میں، پانچ روپے میں۔ آیئے خالہ، آیئے پھوپھو۔"

مگر وہاں اکا دکا لوگ ہی جا رہے تھے۔

زیادہ تر لوگ پارک کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں کھیل کا سامان تھا۔ گھاس پر تازہ ہوا میں بھاگنے دوڑنے یا چہل قدمی کا بندوبست تھا۔

"دیکھ رہے ہو نا۔" شہریار ایک طرف کھڑا اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا: "لوگ فلمیں لینے نہیں جا رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کو صرف اچھی اور صاف ستھری تفریح چاہیے۔ اگر انھیں اور ان کے بچوں کو کھیل کود وغیرہ

کے مواقع مل جائیں تو وہ وڈیو فلموں جیسی حماقتوں کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھیں۔ ہم نے یہ پارک بنایا تو لوگوں نے پورے جوش و خروش سے ہمارا ساتھ دیا۔ جب تفریح کے ایسے مواقع نہیں ملیں گے تو لوگ وڈیو فلموں جیسی تفریحات کی طرف مائل ہوں گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سرفراز نے کہا۔ "مگر اس گولو سیٹھ کا کیا حال ہے؟"

چاروں نے سامنے سڑک کے اس پار عنکبوت وڈیو سینٹر کی طرف دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے اور دو دن بعد وہی ہوا۔

شام کے وقت وہ چاروں وہاں پہنچے تو گولو سیٹھ کے "عنکبوت وڈیو سینٹر" پر تالا پڑا ہوا تھا۔ آس پاس کے دکانداروں نے انھیں بتایا کہ گولو سیٹھ دکان فروخت کر کے اپنے وڈیو کیسٹ سمیٹ کر جا چکا ہے۔

خوشی ان چاروں کے چہروں پر اچانک یوں پھیلی جیسے بادل کے ہٹ جانے سے ہر جانب چاندنی پھیل جاتی ہے۔

"یہ تو ہونا ہی تھا۔" شہریار نے کہا۔ "مکڑی کو ختم ہونا ہی تھا۔"

"یہ مکڑی کہاں سے آ گئی۔؟" سرفراز نے بوکھلا کر پوچھا۔

"ارے۔ تم لوگوں کو معلوم نہیں؟" شہریار نے حیرت سے کہا۔ "بھئی عنکبوت کا مطلب ہوتا ہے مکڑی۔"

"واقعی؟" سرفراز نے پوچھا۔ "پھر تو مکڑی سچ مچ ختم ہو گئی۔ ویری گڈ۔"

شہزاد پارک کے دروازے کی طرف بڑھا۔ حق اسکواڈ کے باقی تینوں ارکان اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ پارک کے دروازے پر پہنچ کر اس نے پوری قوت سے نعرہ لگایا۔ "حق اسکواڈ"

اور باقی سب نے پوری قوت سے جواب دیا۔ "زندہ باد۔"

ان کا نعرہ دور دور تک گونجتا چلا گیا۔

عقیل عباس جعفری

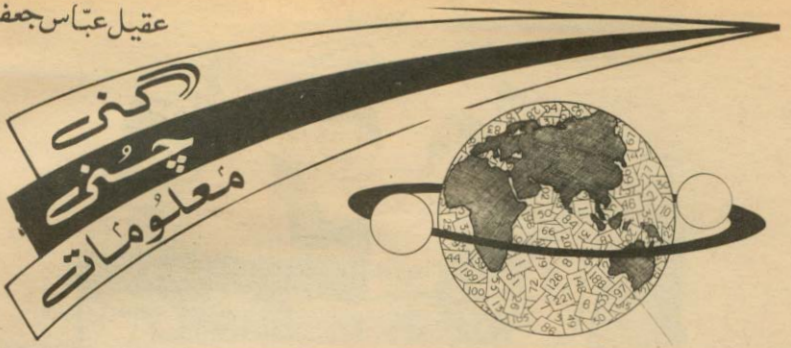

گنی چنی معلومات

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات، ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ (۱) کے عدد سے شروع ہونے والا سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۲۵)

- جب حضورِ اکرمؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی تو آپؐ کی عمرِ مبارک ۲۵ برس تھی۔ آپؐ کی یہ رفاقت ۲۵ سال تک جاری رہی۔
- ہم ایک منٹ میں تقریباً ۲۵ مرتبہ پلک جھپکتے ہیں۔
- انگریز ماہرِ طبعیات لارنس بریگ کی عمر صرف ۲۵ برس تھی جب انھوں نے اپنے والد ولیم
- ہنری بریگ کی معیّت میں ۱۹۱۵ء کا طبعیات کا نوبل انعام حاصل کیا۔ وہ اب تک نوبل انعام حاصل کرنے والے سب سے کم عمر شخص ہیں۔
- ۱۵ دسمبر ۱۷۸۳ء کو فرانس کے باشندے روز یُرنے گرم ہوا کے غبّارے میں دنیا کی پہلی کامیاب پرواز کی تھی وہ ۲۵۶۶ میٹر کی بلندی تک جانے میں کامیاب رہا تھا۔
- ملکہ الزبتھ اوّل جب ۱۷ نومبر ۱۵۵۸ء کو اور ملکہ الزبتھ دوم ۶ فروری ۱۹۵۳ء کو جب برطانیہ کی ملکہ بنیں تو یہ دونوں صرف ۲۵ برس کی تھیں۔
- انگریزی کے عظیم شاعر کیٹس نے فقط ۲۵ برس کی عمر پائی تھی۔

● بحرِ اوقیانوس کو بذریعہ ہوائی جہاز پہلی بار تنِ تنہا عبور کرنے کا اعزاز چارلس لِنڈبرگ نے صرف ۲۵ برس کی عمر میں حاصل کیا تھا۔

● پینگوئن کی پرواز کی رفتار ۲۵ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

● دنیا میں ووٹ ڈالنے کے لیے عمر کی حد۔۔۔سب سے زیادہ انڈورا میں ہے۔ وہاں ۲۵ سال سے کم عمر شخص ووٹ نہیں ڈال سکتا۔

● پچیسی ایک ایسی بساط پر گوٹوں سے کھیلا جانے والا کھیل ہے۔ جس میں چار ٹکڑے ہوتے ہیں اور ہر ٹکڑے میں پچیس پچیس خانے ہوتے ہیں۔

(۲۶)

● قرآنِ پاک میں ۲۶ انبیائے کرامؑ کے نام آئے ہیں۔

● پاکستان کی ۲۶ فیصد آبادی شہروں میں رہتی ہے۔

● انگریزی زبان میں حروفِ تہجی کی تعداد ۲۶ ہے۔

● ٹیسٹ کرکٹ میں اننگز کا کم سے کم اسکور ۲۶ رنز ہے جو نیوزی لینڈ نے ۲۸ مارچ ۱۹۵۵ء کو انگلستان کے خلاف بنایا تھا۔

● اس وقت دنیا میں جمہوریت کا دور دورہ ہونے کے باوجود ۲۶ ممالک ایسے ہیں جہاں بادشاہتیں یا سلطنتیں موجود ہیں۔

● دیوارِ برلن کی لمبائی ۲۶½ میل ہے۔

● اولمپک کھیلوں میں مراتھن دوڑ ۲۶ میل ۳۸۵ گز کے فاصلے پر محیط ہوتی ہے۔

● دنیا میں ۲۶ ممالک ایسے ہیں جن میں ساحلِ سمندر نہیں ہے۔

● امریکہ کے مشہور تیراک مارک اسپٹز نے ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۲ء کے دوران تیراکی کے ۲۶ عالمی ریکارڈز قائم کیے تھے۔

● نیرو نے جب روم کو آگ لگوائی تو اس کی عمر ۲۶ برس تھی۔

● دنیا کے گرد پرواز کرنے والی پہلی خاتون ایمی جانسن نے یہ کارنامہ ۲۶ برس کی عمر میں انجام دیا تھا۔

● غیر وابستہ ممالک کی پہلی کانفرنس ۱۹۶۱ء میں یوگوسلاویہ کے شہر بلغراد میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ۲۶ ممالک کے وفود اور ۳ ممالک کے مبصرین شریک ہوئے تھے۔

- ایک مکعب گز میں ۲۷ مکعب فٹ ہوتے ہیں۔
- شبِ معراج ۲۷ رجب کو اور شبِ قدر ۲۷ رمضان کو منائی جاتی ہے۔
- ایڈگر رائس بروز کا کردار ٹارزن ۲۷ زبانیں جانتا تھا۔
- اپالو ۱۱ کے خلاباز اپنے ہمراہ چاند سے ۲۷ سیر مٹّی اور پتّھروں کے نمونے لائے تھے۔
- وہ جنگیں جن میں حضورؐ نے بنفسِ نفیس حصہ لیا، غزوات کہلاتی ہیں۔ ان جنگوں کی تعداد ۲۷ ہے۔
- انسانی ہاتھ میں ۲۷ ہڈّیاں ہوتی ہیں۔
- خطِ استوا کے اعتبار سے زمین کا قطر ۷۹۲۷ میل / قطبین کے اعتبار سے زمین کے قطر (۷۹۰۰ میل) سے ۲۷ میل زیادہ ہے۔
- مُعمّر قذافی جب یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو برسرِ اقتدار آئے تو ان کی عمر صرف ۲۷ برس تھی۔
- ۱۸۱۲ء میں نپولین نے ۲۷ دن تک ماسکو کے محاصرے کے بعد پسپائی اختیار کی تھی۔
- دنیا کے پہلے خلاباز یوری گگارین نے ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو واسٹوک اول میں زمین کے گرد چکّر لگایا۔ یہ کارنامہ انجام دیتے وقت ان کی عمر ۲۷ برس تھی۔

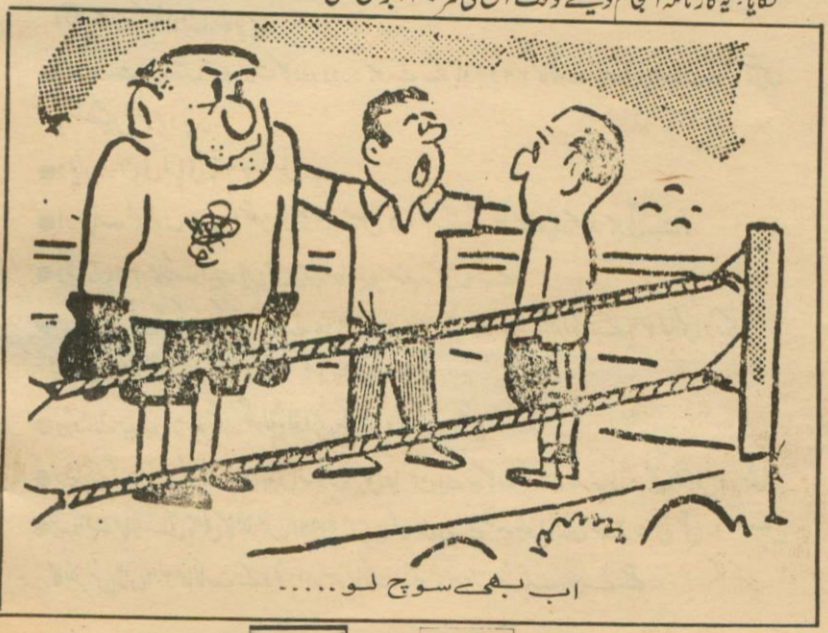

ایک لالچی دولتمند کی کہانی جسے بونے اٹھا لے گئے

وقت کی گاڑی

ایاز محمود

نودولتیا اگر اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس نئی نئی دولت آئی ہو تو محمد رمضان بھی اس تعریف پر پورا اُترتا تھا۔

دولت مند ہونے سے پہلے وہ ایک ادارے میں ملازم تھا۔ تنخواہ گو کہ بہت زیادہ نہ تھی مگر اس کی ضروریات کے لیے ایسی کم بھی نہیں تھی۔

پھر اس کی زندگی میں اچانک وہ دن بھی آیا جب اُس کا شمار امیر و کبیر لوگوں میں ہونے لگا۔ ہُوا یوں کہ ایک روز اس کو اپنے چچا کے انتقال کی خبر ملی جو بہت پہلے افریقہ جا بسے تھے۔ وہاں ان کا کاروبار ایسا جما کہ بس وہیں

کے ہو رہے۔ چونکہ انھوں نے شادی نہیں کی تھی اس لیے آل اولاد کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصّہ محمّد رمضان کے نام کر دیا تھا۔

محمّد رمضان نے اتنی دولت بھلا کب دیکھی تھی۔ اُس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ قسمت کی دیوی اس پر یوں مہربان ہو جائے گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے بہترین علاقے میں اس کا شاندار مکان تعمیر ہو گیا۔ جس میں اس کے آرام و آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ ان تمام اخراجات کے بعد بھی اس کے پاس بہت سی دولت بچ گئی۔ جس کو اُس نے کاروبار میں لگا دیا۔

مثل مشہور ہے کہ پیسے کو پیسا کھینچتا ہے۔ محمّد رمضان کا کاروبار میں لگایا ہوا سرمایہ بھی رات دن بڑھنے لگا۔ دولت کی محبّت نے اُسے اتنا لالچی بنا دیا کہ وہ ہر وقت ایک سے دو بنانے کے چکّر میں لگا رہتا۔ گھر میں خُدا کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ قناعت کی چڑیا اس کے دِل سے اُڑ کر کہیں اور جا بسی ہے اور اس کی جگہ لالچ کے دیو نے اس کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔

اپنی دولت کو بڑھانے کے لیے اس نے سود پر قرض دینا بھی شروع کر دیا۔ ضرورت مند اپنی روپے پیسے کی مشکلات سے تنگ آ کر اس کے پاس آتے لیکن قرض اور سود کے چنگل میں ہمیشہ کے لیے پھنس کر رہ جاتے جو لوگ سود کی ادائیگی کے بالکل ہی قابل نہ رہتے اُن کی جمع پُونجی اور مال و متاع کو نہایت بے رحمی کے ساتھ نیلام کر دیا جاتا اور اس طرح محمّد رمضان کے خزانے میں اور اضافہ ہو جاتا۔ دولت کو بڑھانے اور اُسے جمع کرنے کا جنون اتنا بڑھا کہ محمّد رمضان کی صحت پر بھی اس کے اثرات نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ وہ اپنے وقت سے پہلے ہی بوڑھا لگنے لگا تھا۔ مسلسل فکر نے اُسے بیمار اور چڑچڑا بھی بنا دیا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی دولت کو خود اپنے اوپر خرچ کرنے سے بھی کتراتا تھا۔

انہی دنوں محمّد رمضان کی زندگی میں ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین واقعہ پیش آیا۔ اس رات وہ دن بھر کی مصروفیت سے تھک کر چُور سو رہا تھا کہ دو بونے اس کی خواب گاہ میں چُپکے سے داخل ہوئے، اُسے بستر سے اُٹھایا اور وقت گاڑی میں ڈال کر پرواز کر گئے۔

وقت گاڑی جو خیال کی رفتار سے چلتی تھی جب بونا نگر پہنچی تو محمّد رمضان اُس وقت بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ دونوں بونے جن کا نام انگلو اور چھنگلو تھا، نہایت ادب سے اپنے بادشاہ کے حضور پیش ہوئے اور کہا "آپ کے حُکم کی تعمیل ہو چُکی ہے محمّد رمضان حاضر ہے۔ بونوں کے بادشاہ نے یہ سُنتے ہی حُکم دیا کہ اسے وقت گاڑی میں سوار کر کے صحرائے خواب پہنچا دیا جائے۔

صحرائے خواب دراصل ایک بہت بڑا ریگستان تھا جہاں دُور دُور تک کسی سایہ دار درخت اور پانی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وقت گاڑی نے خیال کی رفتار سے محمد رمضان کو صحرائے خواب میں پہنچا دیا۔ وہ جب نیند سے بیدار ہُوا تو اپنے اِرد گرد کے منظر کو دیکھ کر حیران و پریشان ہو کر رہ گیا "میں تو رات کو اپنے بستر میں سویا تھا" اس نے سوچا۔ "یہ ریگستان کہاں سے آ گیا"۔ اُس نے بار بار اپنے جسم کی چٹکیاں لیں تاکہ اگر وہ خواب دیکھ رہا ہو تو جاگ جائے مگر اس کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ جو کچھ اس کی نظروں کے سامنے ہے وہ خواب نہیں، یہ خیال آتے ہی اُس نے وحشت زدہ ہو کر مدد کے لیے چلّانا اور بھاگنا دوڑنا شروع کر دیا۔ مگر وہاں کوئی ہوتا تو اس کی آواز سُنتا۔ وہ جلد ہی تھک ہار کر بیٹھ گیا اور ریگستان سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا، کچھ دیر بعد اُٹھا اور اندازے سے ایک سمت کی طرف رُخ کر کے چل پڑا۔

صحرائے خواب میں چلتے ہوئے اُسے دو دن گزر چکے تھے اور تھکن، بھوک اور پیاس سے اس کا بُرا حال تھا۔ راستے میں اُسے کئی بار سرسبز سایہ دار درخت اور ٹھنڈے میٹھے نظر آنے والے پانی کے چشمے بھی ملے مگر وہ جب ان کے قریب پہنچتا تھا تو وہ اچانک اس کی آنکھ سے اوجھل ہو جاتے۔ صحرائے خواب میں نظر آنے والی کوئی بھی چیز حقیقی نہیں تھی۔

تھکن سے اب اُسے ایک قدم اُٹھانا دوبھر ہو گیا تھا۔ بھوک تو خیر تھی ہی مگر سب سے بڑی مصیبت پیاس کی تھی۔ پیاس اس کے لیے اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی زبان پر کانٹے نکل آئے ہیں۔

بھوک، پیاس اور کمزوری نے آخر اس کو اتنا نڈھال کر دیا کہ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اب اس کے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ دوبارہ اُٹھ کر اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ مایوسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور پھر بہت دنوں کے بعد اس کو خدا کی یاد آئی وہ خُدا سے دُعا مانگنے لگا کہ وہ کسی کو اس کی مدد کے لیے یہاں بھیج دے ورنہ اس کی موت یقینی ہے۔

اسی موقع پر کہیں سے دو بونے انگلو اور چھنگلو نمودار ہوئے۔ محمد رمضان کی ان کو دیکھ کر جان میں جان آئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ خُدا نے اس کی دُعا کے جواب میں یہ مدد بھیجی ہے۔

"پانی... مجھے پانی پلا دو خُدا کے لیے" اس نے گڑگڑا کر بونوں سے التجا کی۔

"یہ صحرائے خواب ہے" ایک بونے نے باریک سی سنسناتی ہوئی آواز میں اس سے کہا "یہاں کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ اچھا اب چلو، ہم تمھیں لینے آئے ہیں"

انگلو اور چھنگلو نے سہارا دے کر محمد رمضان کو وقت گاڑی میں سوار کرایا۔ اگلے ہی لمحے وہ بونا نگر کے بادشاہ کے دربار میں کھڑے تھے۔

"اسے گوشۂ گمان میں پہنچا دیا جائے"۔ بونوں کے بادشاہ نے محمد رمضان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم حکم دیتے ہیں کہ ہمارے مہمان کی بہترین خاطر تواضع کی جائے اُسے وہی پیش کیا جائے جو اُسے پسند ہے"۔

"جو حکم عالی جاہ" وزیر بونے نے جھکتے ہوئے کہا۔

بادشاہ کے حکم سے مہمان کو گوشۂ گمان لے جایا گیا جہاں خدمت گار بونے طرح طرح کے خوان لے کر آتے رہے جن پر انواع اقسام کے کھانے اور مشروبات سجے ہوئے تھے۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال محمد رمضان اب بے ہوش ہونے کے قریب تھا کہ کھانے پینے کی اشیاء دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پھر سے زندگی کی چمک آئی۔

کھانے پینے کی چیزیں میز پر سجا کر خدمات گار بونے رخصت ہوئے تو محمد رمضان نے بے تابی سے شربت سے بھرے ہوئے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور لرزتے ہاتھوں سے گلاس کو اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔ مگر یہ کیا؟ فرحت بخش مشروب کی جگہ اس کے ہونٹ کسی سخت چیز سے ٹکرائے۔ اس نے گلاس کے اندر غور سے دیکھا تو اس میں پانی کی جگہ بیش قیمت لعل و جواہر بھرے ہوئے تھے۔ پیاس سے پاگل ہوتے ہوئے محمد رمضان نے کئی بار مشروبات کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس کا ہاتھ لگتے ہی مشروب ہیرے جواہرات میں تبدیل ہو جاتا۔

"لعنت ہو ان ہیرے جواہرات پر، جو میری پیاس نہیں بجھا سکتے" اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ مایوس ہو کر اُس نے ایک رس دار پھل کی طرف ہاتھ بڑھایا "اس کو کھانے سے میری پیاس اور بھوک دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا" اس نے سوچا۔ مگر جونہی اس کے دانت پھل کو کاٹنے کے لیے ٹکرائے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پھل نہیں لوہے کے ٹکڑے چبا رہا ہو۔ اس نے غور سے پھل کو دیکھا تو وہ خالص سونے کا بن چکا تھا۔

غرض کہ بہت دیر تک یوں ہی ہوتا رہا۔ وہ نہایت امید کے ساتھ کسی کھانے پینے کی چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتا وہ یا تو کاغذ کے نوٹ بن جاتی یا سونے چاندی یا پھر قیمتی ہیرے جواہرات میں تبدیل ہو جاتی۔

اب اس کی بھوک اور پیاس میں مایوسی بھی شامل ہو چکی تھی۔ اسے یوں لگا کہ اگر یہ مذاق یوں ہی جاری رہا تو وہ جلد ہی مر جائے گا۔ اس کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کمزوری نے اس کے اُوپر بے ہوشی طاری کر دی اور کچھ ہی لمحوں کے بعد اس کا ذہن اندھیروں میں کھو گیا۔

محمد رمضان کے بے ہوش ہوتے ہی انگلو اور چھنگلو کمرے میں داخل ہوئے اور خدمت گار بونوں کی

مدد سے بے ہوش شخص کو بادشاہ کے دربار میں ایک مرتبہ پھر لے گئے۔

"معلوم ہوتا ہے ہمارے مہمان نے کچھ نہیں کھایا پیا۔" بادشاہ سلامت نے سر ہلا کر کہا۔ "اب اسے کمرۂ حرص میں پہنچا دو اور خیال رکھو کہ اس کی خاطر تواضع میں اس بار کوئی کمی نہ آنے پائے۔"

خدمت گار بونے محمد رمضان کو کمرۂ حرص میں چھوڑ کر واپس آ گئے جہاں ہر قسم کے کھانے پینے کی اشیاء کا ایک ڈھیر لگا تھا۔ چلنے سے پہلے ایک خدمت گار نے محمد رمضان کو ایک خاص قسم کی بوٹی سنگھائی جس سے وہ فوراً ہوش میں آ گیا۔

محمد رمضان نے آنکھیں کھولیں تو اُس کے سامنے کھانے پینے کی اشیاء سجی ہوئی تھیں اور بھوک و پیاس سے اس کا بُرا حال تھا۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے شربت کے گلاس کو اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور اچانک اس کو یوں محسوس ہُوا کہ جیسے اس نے آبِ حیات کا گھونٹ بھر لیا ہو۔ ٹھنڈے میٹھے اور فرحت بخش مشروب سے جی بھر کر سیراب ہونے کے بعد اس نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کھانا بھی حیرت انگیز حد تک لذیذ اور خوش بُودار تھا۔ وہ کھاتا رہا، کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ سیر ہو گیا۔

"بہت کھا لیا۔ چلو اب بس کریں۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

مگر یہ کیا ---؟ وہ اپنے ہاتھ کو روکنا چاہتا تھا مگر ہاتھ نے جیسے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ نوالہ بنا منہ تک گیا اور وہاں سے پیٹ کے اندر۔ ہاتھ نے ایک بار پھر یہی حرکت کی۔

"رُک جاؤ --- رُک جاؤ میرے ہاتھ۔" محمد رمضان نے چیخ کر کہا۔ "مجھے اب کھانے کی ضرورت نہیں" مگر اس کے ہاتھ کو نہ رُکنا تھا اور وہ نہ رُکا اور نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالتا رہا۔ کھانا کھا کھا کر کئی مرتبہ اس کو اُلٹی بھی ہوئی مگر اس کا ہاتھ تو گویا رُکنا بھول چُکا تھا۔ وہ اُسے کھانا کھلاتا رہا، کھلاتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ محمد رمضان کی ناک اور کان سے بھی کھانا بہہ کر نکلنے لگا۔ اُسے اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُسے یوں لگا کہ اس کی آنکھیں باہر آ جائیں گی اور کھا کھا کر اُس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔ جلد ہی اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

جب اس کو دوبارہ ہوش آیا تو بونوں کے بادشاہ کے دربار میں پایا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بادشاہ سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ "میں اپنے گھر میں سویا تھا مگر وہاں سے صحرائے خواب جا پہنچا اُدھر سے گوشۂ گمان اور پھر کمرۂ حرص۔ یہ سب کیا جادو ہے؟"

"یہ جادو نہیں بلکہ تمہارے لیے ایک چھوٹا سا سبق ہے۔"

"سبق ...؟"

"ہاں ...! بونوں کے بادشاہ نے کہا: "تم دنیا کے میلے میں اس طرح گم ہو گئے تھے کہ حقیقت کو بھول ہی گئے تھے۔ بلکہ آنی جانی اور ناپائیدار چیزوں ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے۔ تمھیں صحرائے خواب جا کر احساس ہوا ہوگا کہ حقیقت وہ نہیں جس کے لیے ہم دن رات آگے پیچھے بھاگا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ تو بہت ہی حقیر سی چیزیں ہیں۔ اگر دولت، روپے پیسے کی ذرہ بھر بھی حقیقت ہوتی تو اللہ کے نیک بندے دُنیا کے امیر ترین افراد ہوتے۔"

بادشاہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "گوشۂ گمان میں جب تمھیں لے جایا گیا تو تم بھوکے اور پیاسے تھے۔ مگر سونا چاندی اور ہیرے جواہرات تمھاری بھوک اور پیاس کو ختم نہ کر سکے۔ کمرۂ حرص میں تمھیں یہ یقین دلانا تھا کہ جب لالچ ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو کیا حشر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اصل سکون اور طمانیت بانٹنے اور دینے سے ملتی ہے چھیننے اور حاصل کرنے سے نہیں۔" بادشاہ نے نرمی سے کہا۔

بونوں کے بادشاہ کی یہ گفتگو سُننے کے بعد محمد رمضان نے سر جھکا کر کہا: "مجھے اعتراف ہے کہ میں بے مقصد اپنی زندگی کو خرچ کرتا رہا اور حاصل کچھ بھی نہ ہُوا۔"

اس کے بعد کے واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ کے حکم سے محمد رمضان کو شربتِ سکون پلایا گیا، جس کو پیتے ہی اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے اُس کی تمام پریشانیاں آہستہ آہستہ اس کا پیچھا چھوڑ رہی ہیں۔ اس کو سکون سا محسوس ہُوا اور آنکھیں خود بخود بند ہوتی گئیں۔ وقت گاڑی نیند کی حالت میں محمد رمضان کو پھر اس کے کمرے میں چھوڑ آئی۔ تھوڑی دیر بعد صبح کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور اس کی زندگی کے ایک ایسے دور کا آغاز ہو رہا تھا جس میں کنجوسی، لالچ اور ظلم کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ محمد رمضان اب ایک سخی، رحم دل اور انصاف پسند انسان بن چکا تھا۔

راہنما

۱۰۴ صفحات پر مشتمل

سچی قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچی کہانیاں بچوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر ارسال کر دیجیے۔

سائنس انکوائری

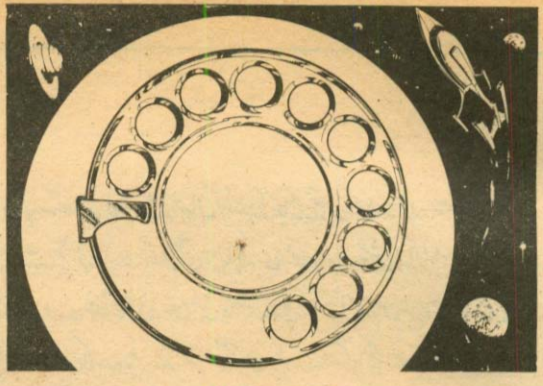

نیّر ابدالی

● مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ یہ کہ لوگ آب دوز میں دُور دراز کا سفر کیسے طے کر لیتے ہیں؟ (سحر ناز چوہنگ، لاہور)

بھئی آپ کی حیرانی بالکل بجا ہے۔ اس لیے کہ آپ نے کبھی آب دوز میں سفر جو نہیں کیا۔ جس طرح ہوائی جہاز کا ماحول ہوتا ہے بالکل اسی طرح آب دوز کا ماحول بھی ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہوائی جہاز فضاؤں میں جب کہ آب دوز سمندر کی گہرائی میں سفر کرتی ہے۔ دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ سفر کے دوران نہ تو باہر سے ہوا اندر آتی ہے اور نہ باہر جاتی ہے۔ یعنی دونوں جہازوں میں ہوا کا معقول بند و بست ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کی نسبت آب دوز کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ بغیر سطح آب پر آئے مہینوں پانی میں رہ سکتی ہے۔ جب کہ ہوائی جہاز چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد لینڈنگ ضرور کرتا ہے تاکہ ایندھن وغیرہ لے سکے۔ ابھی تک آبدوز کا استعمال صرف جنگی مقاصد یا تحقیقی مقاصد کے لیے ہوتا ہے یعنی عام مسافروں کی سروس شروع نہیں کی گئی۔ مگر اس کے باوجود آب دوز کے عملے کے لیے کھانے، پینے، آرام، تفریح اور بیرونی دُنیا سے مستقل رابطے کا معقول انتظام ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے پیشے سے لگن کی بدولت ہفتوں اور مہینوں زیرِ آب رہتے ہیں۔

● مجھے آپ سے "ریل گاڑی" کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ یہ کس طرح ایجاد ہوئی؟ (مقصودہ بائی اشرف طائی کوٹری۔ فاطمہ زہرہ۔ لفیر آباد۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

آج تو ریل کی سواری بڑی آرام دہ ہے جس کے ذریعے انسان اور اس کے استعمال کا سامانِ تجارت ایک جگہ سے

دوسری جگہ جاسکتا ہے۔ ایک زمانے میں یورپ کے ان علاقوں میں جہاں کوئلے کی کانیں تھیں، کوئلہ کانوں سے نکالنے کے لیے گھوڑا گاڑی استعمال ہوتی تھی۔ اس میں بڑی دقت ہوتی تھی چنانچہ کسی نے یہ خیال پیش کیا کہ زمین پر لکڑی کی لمبی لمبی پٹیاں رکھ کر گاڑی کو کھینچا جائے تاکہ وزن سے گاڑی زمین میں دھنسنے نہ پائے چنانچہ اس طرح پہلی گاڑی وجود میں آئی۔ ۱۸۰۴ء میں جنوبی انگلستان میں پہلی باقاعدہ پبلک ریلوے "سرے آئرن ریلوے" کے نام سے قائم ہوئی۔ جو صرف بار برداری کے مقاصد کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اسی سال ایک انگریز انجینئر رچرڈ ٹریوی تھک نے بھاپ سے چلنے والا انجن بنایا۔ مگر جارج اسٹیفنسن اور اس کے بیٹے رابرٹ اسٹیفنسن کا نام سب سے نمایاں ہے۔ جنھوں نے ۱۸۲۹ء میں اپنے انجن "راکٹ" کی کامیاب آزمائش کا مظاہرہ کیا جو انگلستان کے شہر مانچسٹر اور لیورپول کے درمیان چلایا گیا۔

● برف باری کیسے ہوتی ہے؟ (ظہور احمد بلوچ۔ اوتھل۔ ضلع لسبیلہ۔ کراچی۔ رفعت۔ نئی کراچی)

پانی سورج کی تمازت سے بخارات بن کر اڑنے لگتا ہے۔ بہت بلندی پر پہنچ جانے کے بعد جب یہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو دوبارہ پانی کے قطرے یا برف کی شکل میں ٹھوس حالت اختیار کر لیتا ہے۔ کئی وجوہات کی بنا پر یہ دوبارہ زمین پر گرنے یا برسنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ چنانچہ برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ برف باری شروع ہونے سے پہلے سردی میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ آدمی خوب دوڑے بھاگے اور اُچھل کود کرے۔ مگر برف باری ہو جانے کے بعد آدمی صرف اور صرف یہ کوشش کرتا ہے کہ ہڈیوں میں اُتر جانے والی سردی سے کس طرح بچا جائے۔

● ہمیں سورج کے بارے میں یہ معلوم کرنا ہے کہ کہیں اس کی تیز گرمی اچانک ختم نہ ہو جائے (حمیرا تبسم علوی اورنگی ٹاؤن۔ کراچی۔ نورین عتیق۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی۔ محمد یوسف مرزا۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

کائنات میں موجود کروڑوں ستاروں میں ایک ستارہ ہمارا سورج بھی ہے۔ جو ہم سے ۹۳ کروڑ تیس لاکھ میل دور واقع ہے۔ یہ ہمارے نظام شمسی کا مرکز ہے۔ سورج جلتی ہوئی گیسوں کا مرکب ہے۔ صرف اس کی سطح کا درجہ حرارت چھ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ اس کی سطح سے اُٹھنے والے شعلے لاکھوں میل دُور تک جاتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسرے ستاروں کی طرح ایک دن سورج کی روشنی بھی ماند پڑ جائے گی مگر یہ عمل اچانک

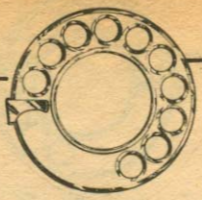

نہیں ہوگا بلکہ اس میں بڑا طویل عرصہ لگے گا۔ اس طویل عرصے کا کوئی حتمی اندازہ تو نہیں البتہ ماہرینِ فلکیات کا کہنا ہے کہ اس میں کھربوں سال لگ جائیں گے۔ چنانچہ اب آپ سورج کے ٹھنڈا ہونے کا اندیشہ اپنے دل سے نکال دیں۔

● ٹیلی پرنٹر مشین کیا کام کرتی ہے؟ (حافظ محمد اکرم سیال تبسم۔ وکیل والا۔ ننکانہ صاحب۔ سیّد عاطف امام۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی۔)

یہ دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی ٹیلی بمعنی دُور اور پرنٹر بمعنی چھاپنے والا۔ یعنی وہ آلۂ جو دُور کے پیغام کو چھاپ کر مشین سے باہر نکال دیتا ہے۔ آپ نے یقیناً گھر میں آنے والے ٹیلی گرام کو ضرور دیکھا ہوگا جس پر پیغام درج ہوتا ہے۔ یہ پیغام اسی ٹیلی پرنٹر مشین کے ذریعے بھیجا جاتا ہے۔ جس جگہ سے پیغام روانہ کیا جاتا ہے۔ وہاں مشین پر ایک شخص پیغام کو ٹائپ کر دیتا ہے۔ مشین پر بالکل ٹائپ رائٹر کی طرح کا بورڈ بنا ہوتا ہے۔ اب جس جگہ اس پیغام کو بھیجا جانا مطلوب ہے اُس جگہ دوسری مشین خود بخود اسے وصول کر کے کاغذ کے ایک رول پر ٹائپ کیا ہوا پیغام باہر نکالنا شروع کر دیتی ہے۔ اس مشین کا سب سے زیادہ استعمال اخبارات میں ہوتا ہے جہاں دُنیا بھر کی خبریں ہر وقت مشین سے باہر نکل رہی ہوتی ہیں۔ اور ہر خبر متعلقہ شعبے کے سب ایڈیٹر یا رپورٹر کی میز پر پہنچا دی جاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر اس مشین کا استعمال ڈاک و تار کے محکمے میں ہوتا ہے۔ جہاں لوگ خوشی اور غم، کامیابی اور سفر سے متعلق پیغامات ایک شہر سے دوسرے شہر بھجواتے ہیں۔

● کیا آپ ہمیں بحرالکاہل اور بحرِ مُردار کی کچھ خصوصیات بتانا پسند کریں گے؟ (عرفان خالد۔ بڑا بورڈ۔ کراچی، افشین فاطمہ۔ ناظم آباد۔ کراچی)

بھئی پہلی بات تو یہ ہے کہ بحرالکاہل دُنیا کا سب سے بڑا اور گہرا سمندر ہے۔ بحرالکاہل مجموعی طور پر ۱۶۵، ملین مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی گہرائی گیارہ ہزار میٹر کے قریب ہے چونکہ اس کا بہاؤ بہت سُست ہے لہٰذا اس کو بحرالکاہل اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے۔ بحرِ مُردار مغربی ایشیا میں واقع ہے۔ اس کا پانی اتنا نمکین اور کڑوا ہوتا ہے جس کی بنا پر اس میں کوئی مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اس سمندر میں وہ شخص بھی

تیر سکتا ہے جو تیراکی نہیں جانتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نمکین زیادہ ہونے کی بنا پر اس کا پانی زیادہ بھاری ہوتا ہے جو تیراک کو ڈوبنے نہیں دیتا۔ بحرِ مُردار سطح سمندر سے ۳۹۲ میٹر نیچے ہے۔

● یہ خطِ استواء کیا ہوتا ہے؟ (سیّد حسین عالم۔ سیّد فرید عالم۔ اورنگی ٹاؤن کراچی)

یہ سچ مُچ کا کوئی خط نہیں ہے۔ بلکہ جغرافیہ دانوں نے زمین کے عین درمیان میں ایک فرضی خط تصوّر کیا ہے یہ خط زمین کو دو برابر حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جسے ہم شمالی نصف کُرہ اور جنوبی نصف کرہ کہتے ہیں۔ اس خط کے آس پاس جو ممالک ہیں وہ بہت زیادہ گرم ہوتے ہیں۔ ۲۱ مارچ اور ۲۲ ستمبر کو سورج کی روشنی براہِ راست خطِ استوا پر پڑتی ہے

● کیا آپ ہمیں زمین کا قطر بتانا پسند فرمائیں گے؟ (شبانہ رحیم۔ سلطانہ رحیم۔ ناظم آباد کراچی)

جی ہاں! کیوں نہیں۔ زمین کسی گیند کی مانند گول ہرگز نہیں ہے خطِ استواء پر اس کا قطر ۱۲،۷۵۶ کلومیٹر یا ۷۹۲۶ میل ہے۔ جب کہ قطبِ شمالی سے قطبِ جنوبی تک اس کا قطر ۱۲،۷۱۳ کلومیٹر یا ۷،۸۹۹ میل ہے۔ آپ کی معلومات کے لیے ہم آپ کو یہ بھی بتائے دیتے ہیں کہ زمین کا وزن ۶۲ ۵۸ ملین ملین ملین ٹن ہے۔

● کیا یہ حقیقت ہے کہ ڈائنوسار وغیرہ جیسے جانور اس زمین پر موجود رہ چکے ہیں؟ (اظہار احمد۔ نارتھ۔ کراچی۔ سید وجاہت علی کورنگی کراچی۔ محمد صالح۔ کورنگی۔ کراچی۔ محمد یاسر کورنگی۔ کراچی۔ محسن علی۔ کورنگی۔ کراچی)

جی ہاں! یہ حقیقت ہے کہ ڈائنوسار جیسے دیوہیکل جانور اس زمین پر موجود تھے۔ ان کا زمانہ ۲۲۵ ملین سال قبل کا ہے۔ یہ ۶۵ ملین سال قبل تک موجود رہے۔ ان کے قد و قامت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ایک عام ڈائنوسار آج کی ایک تین منزلہ عمارت کی اونچائی کے برابر ہوتا تھا۔ سب سے لمبے ڈائنوسار ڈپلوڈوکس کی لمبائی کا اندازہ ۳۰ میٹر لگایا گیا ہے جب کہ سب سے بڑے ڈائنوسار" بریکیوسارس" کا وزن ۱۰۰ ٹن تھا۔ کھڑے ہوتے پر اس کی اونچائی ۱۲ میٹر ہوتی تھی۔ اس کی ہڈیاں افریقہ اور شمالی امریکہ میں دریافت ہو چکی ہیں۔

● اس وقت دُنیا کی آبادی کتنے افراد پر مشتمل ہے؟ (ریحان خالد۔ کامران خالد۔ مہناز جاوید۔ بیڈ بورڈ۔ کراچی)

ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا کی آبادی اس وقت پانچ ارب افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں تقریباً ایک ارب کی آبادی والا ملک ہمارا عظیم ہمسایہ ملک چین ہے۔ آج سے دس ہزار سال پہلے اس زمین پر انسانوں کی تعداد صرف دس ملین تھی۔

دلچسپ سائنسی کھیل

سُوئی تیرتی ہے !!

آپ نے سمندر میں بڑے بڑے جہازوں کو چلتے ہوئے یقیناً دیکھا ہوگا۔ جو پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں رہتے ہیں۔ یہ کتنی حیرانی کی بات ہے کہ پانی میں اتنے بڑے بڑے جہاز تو مزے سے تیرتے اور چلتے ہیں مگر سوئی جیسی ہلکی اور نازک سی چیز بڑی آسانی سے ڈوب جاتی ہے۔

مگر ہم آپ کو جو طریقہ بتانے والے ہیں اس پر عمل کیا جائے تو سوئی پانی میں ڈوبنے کے بجائے بڑی آسانی سے تیرتی رہے گی۔ اس کا عملی مظاہرہ کرکے آپ اپنے دوستوں پر اپنی قابلیت کا سکہ بڑی آسانی سے جما لیں گے۔ یہ تجربہ بھی نہایت آسان اور اسے کسی بھی جگہ کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے۔

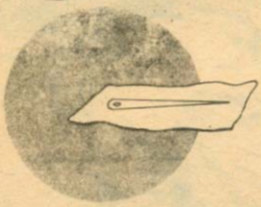

سب سے پہلے تو آپ یہ کریں کہ ایک بڑے شیشے کے گلاس میں آدھے سے زیادہ پانی بھر لیں۔ اب ایک ٹشو پیپر کے چھوٹے سے ٹکڑے کو جس پر سوئی آسانی سے رکھی جاسکے لے کر اس پر احتیاط سے سوئی رکھ دیں۔

اس کے بعد ٹشو پیپر کے اس ٹکڑے کو سوئی سمیت پانی میں آہستہ سے رکھ دیں۔ صرف یہ احتیاط کریں کہ گلاس کسی طرح ہلنے نہ پائے۔

ارے !! ٹشو پیپر تو گیلا ہو کر نیچے بیٹھنے لگا !! مگر یہ کیا ! سوئی تو واقعی پانی کی سطح پر مزے سے تیر رہی ہے۔ ہے نا حیرت کی بات !

عظمت کا راز

ابوظفر زین

اگر آپ حوصلہ ہار بیٹھے ہیں تو اس کہانی کو ضرور پڑھیے

میں نے گیارہ بارہ سال کی عمر سے جونیئر لیگ میں فٹ بال کھیل رہا تھا۔ میرے قد، صحت اور ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے گولڈن کلب نے میری تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ میں چھ سال تک کھیلتا رہا۔ بہت سے میچ کھیلے لیکن اُس معیار پر نہ پہنچا جو اسٹار کھلاڑی کو جونیئر لیگ میں ہونا چاہیے۔ گولڈن کلب والے ناامید نہ تھے۔ وہ کہتے تھے ابھی اور مشق و تجربہ کی ضرورت ہے لیکن ساتھی کھلاڑی مجھے کوئی لفٹ نہیں دیتے۔ اور تماشائیوں کی طرف سے بھی میری کوئی ہمت افزائی نہ ہوتی۔ بہرکیف چھ سال کی مشق، محنت اور تجربہ کے بعد سینیئر لیگ میں کھیلنے کے لیے میرا انتخاب کر لیا گیا۔ اگرچہ فی الحال اکسٹرا کے طور پر، میں نے طے کر لیا کہ ابھی اور محنت کروں گا۔

گولڈن کلب میں جو کھلاڑی ان دنوں سب سے مقبول اور مشہور تھا اس کا نام تھا الفی بارکر۔ لیکن اس کی عمر زیادہ ہو رہی تھی اور وہ ریٹائر ہونے والا تھا۔ کلب والے چاہتے تھے میں اس کی جگہ لوں۔

میں نے بار بار الفی کے کھیل کا معائنہ کیا کہ وہ کھیل کے دوران کون کون سے داؤ پیچ اور حکمت عملی استعمال کرتا ہے۔ بے شک وہ تعریف اور اعزاز کا مستحق تھا۔ وہ سینٹر ہاف کی پوزیشن سے کھیلتا۔ بال پاس کرنے، لمبی اور مختصر دونوں کِک لگانے اور اسکور کرنے میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ جس میچ میں وہ کھیلتا، ٹکٹیں زیادہ بکتیں اور اس کا کھیل دیکھ کر تماشائیوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں، خوب تالیاں بجتیں۔ لیکن گزشتہ دو سال سے وہ موٹا اور سست ہوتا جا رہا تھا اور امسال کے میچوں میں اس کا اسکور بہت کم رہا۔ پبلک میں اس کی مانگ گھٹتی جا رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ الفی بارکر تھا۔ اور میں اس کے سامنے طفلِ مکتب۔

ایک دن میں نے گولڈن کلب کے مینجر ولیم جیمز سے کہا۔ "میں اچھا کھیل پیش کرنے کی اتنی کوشش کرتا ہوں لیکن کھیل نہیں پاتا۔ آپ کی ٹیم میں الفی بارکر ہے، پھر میری کیا ضرورت؟"

"بیٹے! الفی بتیس سال کا ہو گیا ہے، وہ کب تک چل سکے گا؟" مینجر نے اطمینان سے کہا۔

تھوڑی دیر کی اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد مینجر جیمز نے پوچھا۔ "تمھارے خیال میں الفی کی سب سے عجیب صلاحیت کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہ اُچھلتا بہت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اُڑن پرندہ ہے۔ وہ بیشتر گول سر سے کرتا ہے مگر اب اُس میں پہلی جیسی پھرتی نہیں ہے۔"

"اور اُس کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟"

"وہ اُس اسپیڈ سے نہیں دوڑتا جس اسپیڈ سے دوڑنا چاہیے۔ وہ گیند کے پیچھے بھاگتا بھی نہیں ہے اور ہر پانچ منٹ کے بعد تازہ دم ہوتا ہے۔"

"تمھارا خیال صحیح ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ٹانگوں اور کمر کے ساتھ ساتھ ہی کھیلو۔ الفی سے سیکھو کہ ٹانگوں کے ساتھ سر سے بھی کھیلنا زیادہ اسکور لاتا ہے، دیکھو بال زیادہ مت بڑھاؤ اس سے کھیل خراب ہوتا ہے۔"

میں نے ان خیالات کو ذہن میں اچھی طرح بٹھا لیا۔

کلب میں اور کھیل کے میدان میں مجھے اکثر الفی بارکر سے ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا۔ وہ مجھے زیادہ لفٹ نہیں دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آئندہ سیزن میں اُسے ریٹائر ہونا ہی ہے۔ اور یہ میں ہی ہوں جو اس کی جگہ لوں گا۔ میں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی بہت کوشش کی۔ میں نے کبھی اُسے نقصان نہیں پہنچایا، میں نے ہمیشہ اس کی عزت

کی لیکن خدا جانے کیوں وہ مجھ سے بات کرنے میں اپنی توہین سمجھتا تھا۔ بہر حال یہ اپنا اپنا ظرف ہے۔

اِدھر میرا کھیل کچھ ترقی کر گیا۔ میں نے ہیڈ لگانے یعنی اُچھل کر بال کو سر سے مارنے کی مشق کر لی۔ مجھے اُمید تھی کہ چونکہ اب الفی ہار کر سے گول نہیں ہو رہے ہیں اس لیے اس کی جگہ مجھے سینٹر ہاف کھلایا جائے گا لیکن ہفتوں پر ہفتے گزرتے چلے گئے سینٹر ہاف سے الفی ہی کھیلتا رہا۔ دوسرے کھلاڑی مجھ سے کہنے لگے "نہیں! تم الفی کی جگہ نہیں لے سکو گے۔ تماشائی ابھی تک اس کی وجہ سے ٹکٹ خریدتے ہیں۔ تمھیں چانس اسی صورت میں ملے گا جب الفی کی ٹانگ اُکھڑ جائے۔"

الفی کی ٹانگ تو نہیں اُکھڑی لیکن دو ہفتوں کے بعد مورچ آگئی اور نس چڑھ گئی۔ چنانچہ اگلے ہفتے میچ میں مجھے سینٹر ہاف بن کر اُترنا پڑا۔ میچ بہت سنسنی خیز رہا۔ میں نے جان لڑا دی۔ لیکن ہماری ٹیم ایک گول سے میچ ہار گئی۔ اپنی طرف سے واحد گول میں نے ہی بنایا۔

اگلے ہفتے پھر ایک اہم کوارٹر فائنل میچ درپیش تھا اور پھر مجھے ہی سینٹر فارورڈ کھیلنا پڑا اور بدقسمتی سے ہماری ٹیم یہ میچ بھی ہار گئی۔ ہارنے کے باوجود میری کارکردگی اچھی رہی۔

اس میچ کے بعد کلب کا صدر میرے پاس آیا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "ہمت نہ ہارنا۔"

"باس!" میں نے کہا "میں نے اپنی سی کوشش کی ہے لیکن ابھی الفی کے معیار تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔ کیا الفی کے تندرست ہونے کے بعد مجھے یہ پوزیشن چھوڑنی پڑے گی؟"

"الفی کا علاج ہو رہا ہے۔" وہ بولا "دیکھو علاج ہو جانے کے بعد ہی ہم لوگ کوئی بات کہہ سکتے ہیں، بہر کیف تم ہمت نہ ہارو۔ الفی اب جوانی سے آگے بڑھ رہا ہے، تم جوانی میں داخل ہو رہے ہو۔ کیا وجہ ہے کہ تم ترقی نہ کرو۔"

"تماشائی مجھے پسند نہیں کرتے ہیں اور میرے خلاف نعرے لگاتے ہیں۔"

"نہیں، تم تماشائیوں کو پسند نہیں کرتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تمھارے کھیل کو لازماً پسند کیا جائے۔ حالانکہ تمھارا فرض ہے کہ تم اپنے کھیل کو اُن کی پسند کے مطابق بناؤ۔ الفی نے اسی طرح اپنے آپ کو ہیرو بنایا ہے۔ جیت اور ہار کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن تماشائی تماشا پسند کرتے ہیں اور دل بہلانے کے لیے پیسے خرچ کرتے ہیں۔"

میں نے صدر کی باتوں کو گرہ میں باندھ لیا۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ اس کے بعد دو اہم میچوں میں میں نے بہت خراب کھیلا۔ تماشبینوں نے بہت ہوٹنگ کی۔ نعرے لگائے "الفی کو لاؤ، الفی کو لاؤ۔" الفی خصوصی مہمانوں کے پنچ پر بیٹھا دانت نکالے ہنس رہا تھا گویا وہ مجھ پر طنز کر رہا ہو۔ اور طنز وہ چیز ہے جو میری ہمت کو سب سے زیادہ پست کر دیتی ہے۔

دوسرے دن جب میں ٹریننگ کیمپ پہنچا تو کلب کے صدر نے مجھے اپنے دفتر میں بلا بھیجا۔ میں ڈر گیا۔ شاید میرا پتہ کٹ گیا۔ اب میں آئندہ سینٹر فارورڈ نہیں کھیل سکوں گا۔ اُدھر الفی بھی ٹھیک ٹھاک ہو چکا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی جب صدر مجھ پر مہربان نظر آیا۔ بولا "میں جانتا ہوں کہ تماشائیوں نے تمھیں بہت ہوٹ کیا۔ مگر میں یہاں کھلاڑیوں کا انتخاب کرتا ہوں تماشائیوں کا نہیں۔ اچھے سے اچھا کھلاڑی کبھی کبھی خراب کھیل جاتا ہے۔ دس سال لگ جاتے ہیں اچھا کھلاڑی بننے اور بنانے میں۔ یہ سمجھ لو کہ ہر وہ رقم جو تمھیں ملتی ہے تماشائیوں کی جیب سے آتی ہے۔ تماشائی اہم سوال ہیں۔ ہمت نہ ہارو۔ بہتر سے بہتر کھیلنے کی کوشش کرو۔ آئندہ میچ بہت اہم ہے ہاڈر فورڈ شائر کے خلاف تم ہی سینٹر فارورڈ کھیلو گے شاباش۔"

میں اس کے آفس سے خوشی کے مارے ناچتے ہوئے نکلا۔

اب الفی ہارکر کی باری تھی صدر سے ملنے کی۔ وہ آفس کے باہر کھڑا تھا اپنا طنزیہ دانت نکالے ہوئے۔ میں اس سے کچھ نہیں کہا۔ غالباً صدر نے اس کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا۔ اس کی ہمت کچھ پست ہو گئی۔

ہاڈر فورڈ شائر کے خلاف جو میچ تھا وہ تمام ٹیم بلکہ ہر کھلاڑی کے لیے ایک امتحان تھا۔ ہر شخص کی نگاہیں مجھ پر لگی تھیں اور میں نے اُنھیں مایوس نہیں کیا۔ میں نے بہت اچھا کھیل کھیلا۔ میں نے ایک پنالٹی مارا جو ناکام رہا۔ ایک کارنر مارا ناکام رہا۔ بہرکیف میں نے ایک گول کر ہی دیا۔ مخالف ٹیم نے ایک کامیاب پنالٹی مارا اور ایک کامیاب لانگ شاٹ اور ہم میچ دو کے مقابلے میں ایک گول سے ہار گئے۔ میرے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی اور میں ذرا لڑکھڑا رہا تھا۔

میں مسلسل میچ ہار تا رہا تھا۔ اتنا اچھا کھیلنے کے باوجود میں نے سوچا کہ اب موقع الفی ہارکر کو دینا چاہیے۔ میں صدر کے آفس میں گیا۔ میں نے اپنے خیالات سُنا دیے۔

"میں اپنی پوری طاقت لگا رہا ہوں لیکن ہار جاتا ہوں۔ اگرچہ پنالٹی میں میرا کوئی قصور نہیں۔ کیا ٹیم کی نیک نامی کے لیے بہتر نہ ہو گا کہ الفی کو موقع دیا جائے، تمام تماشائی میرے خلاف نعرے لگاتے ہیں۔"

باس نے کہا "ہر میچ میں دونوں ٹیموں کے ہمدرد ہوتے ہیں اور حریف کے خلاف نعرے لگاتے ہیں۔ تم اپنی حریف ٹیم والوں کو دشمن سمجھ کر مت کھیلو، دوست سمجھ کر کھیلو۔ ہر میچ کے بعد حریف ٹیم والوں سے ملو تاکہ ان کی محبت حاصل کر سکو۔ مگر تمھاری صدفی صد وفاداری اپنی ٹیم سے رہے۔ دوم تم اپنا ٹارگٹ بڑھا دو۔ اب تک تم ایک گھنٹہ میں ایک گول کرتے رہے ہو۔ اب ہر ہاف میں ایک گول کرو۔ اس بات کو بھول جاؤ کہ لوگ کیا نعرے لگا رہے ہیں۔ تمھارا سارا دماغ گول کرنے کی طرف لگا رہے۔ جاؤ آئندہ چار میچ تمھیں ہی کھیلنا ہیں۔ پھر اس کے بعد فیصلہ ہو گا۔"

آئندہ دو ماہ تک الفی ہارکر لندن شہر کی بڑی بڑی ٹیموں کے خلاف میچ کھیلتا رہا۔ کبھی جیت کبھی ہار۔ اور میں شہر سے

باہر کی ٹیموں کے خلاف میچ کھیلتا رہا کبھی جیت کبھی ہار۔

سیزن ختم ہو رہا تھا۔ سیزن کا آخری میچ تھا یورپ کپ فائنل۔ سب سے سنسنی خیز، سب سے زبردست مقابلہ۔ یورپ کپ میں یورپ کی بہترین ٹیمیں حصّہ لیتی ہیں اور اپنی بہترین کارکردگی والوں کو منتخب کرتی ہیں۔ یہ لیگ نہیں ہے کہ ہارنے کے بعد بھی کھیلنے کا موقع ملے۔ ایک ہار اور ٹورنامنٹ سے باہر۔ ہمارا گولڈن کلب فائنل میں پہنچنے کے لیے پوری طاقت لگا رہا تھا اور کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ صدر کو بڑی فکر تھی کہ میرے اور الفی کے درمیان جو سرد جنگ چھڑی رہتی ہے وہ ختم ہو جائے، کیوں کہ یہ چیز ٹیم ورک کو خراب کرتی ہے۔ اُس نے ہم دونوں کو بلایا اور ایک دوستانہ میچ کا بندوبست کیا اس نے کہا، "دونوں ٹیمیں گولڈن کلب کی ہوں گی۔ ایک ٹیم کا کپتان الفی ہارکر ہوگا اور دوسری ٹیم کا کپتان ..."
اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہوں گے۔ دونوں میں جو ٹیم جیتے گی اس کا کپتان یورپ کپ کے میچوں کا کپتان ہوگا۔ اور ہاری ہوئی ٹیم کا کپتان نائب کپتان ہوگا۔"

ہم دونوں اس تجویز سے خوب متفق ہوئے۔ یہ دوستانہ میچ آئندہ سنیچر کے لیے طے ہوگیا۔

میچ بہت گمبھیر تھا۔ ہم دونوں کپتانوں نے اپنے اپنے آخری گُر، آخری ہتھکنڈے سبھی استعمال کر ڈالے۔ ایک دوسرے کے خلاف گول کرنے کی تمام محنتیں اور کوششیں لگا دیں۔ دونوں ٹیموں نے بھی اپنے اپنے کپتانوں کی ہر طرح مدد کی۔ یہ یادگار میچ تھا جس کی فلمیں لی گئیں اور ملک کے تمام سینما ہالوں میں دکھائی گئیں لیکن میرے لیے اس میچ میں خوشی کا کوئی پہلو نہ تھا کیوں کہ میری ٹیم دو کے مقابلے میں ایک گول سے ہار گئی تھی۔ الفی ہارکر کو آئندہ یورپ کپ کے میچوں کے لیے کپتان تقریباً چن لیا گیا تھا۔

اگلی صبح جب کہ میں بستر پر لیٹا اپنی شکست پر غور کر رہا تھا کہ الفی ہارکر آپہنچا۔ اسے دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اس نے آتے ہی کہا "میں تمھیں اپنا فیصلہ سُنانے آیا ہوں۔ یورپ کپ کے میچ کی قیادت تم کرو گے، میں تمھارے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔"

"لیکن کیوں الفی؟" میرا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اس لیے کہ تم ابھی نوجوان ہو۔ میری عمر ڈھل رہی ہے۔ یورپ کپ کی کپتانی سے زیادہ میچ کا جیتنا اہم ہے۔ یہ ٹیم کی عزّت کا معاملہ ہے۔ کیا سمجھے!" الفی ہارکر نے کہا۔

اس روز مجھے معلوم ہوا کہ الفی ہارکر کو تماشائی کیوں پسند کرتے ہیں۔ الفی کو اپنی ذات سے زیادہ ٹیم عزیز تھی۔ یہ ایک اچھے کھلاڑی کی پہچان تھی۔

قسط نمبر ٦

دھماکہ

اظہر نیاز

تخریب کاری کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ اہم انکشاف

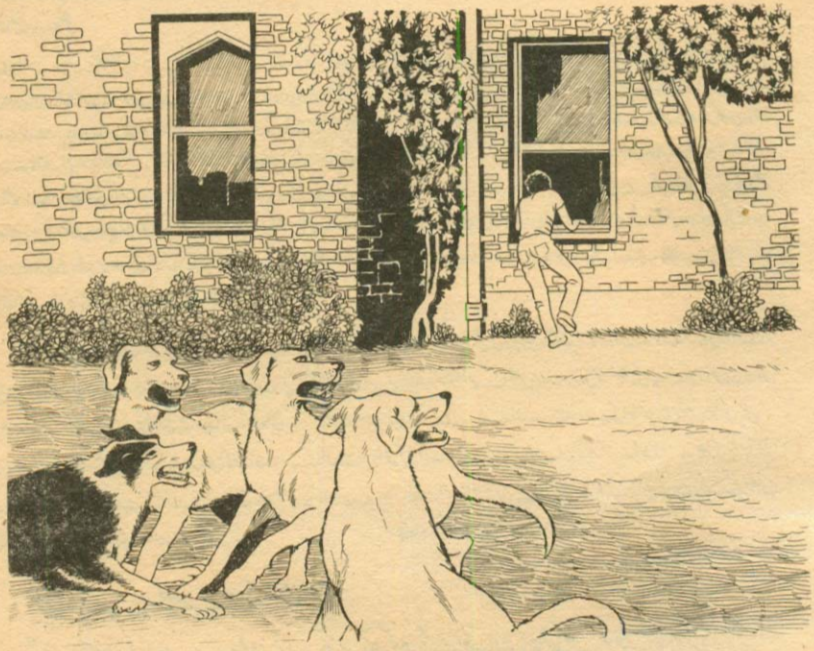

اس بار جو دھماکہ ہوا تھا، وہ اتنا شدید تھا کہ اُس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ذیشان کو ان دھماکوں نے پریشان کر رکھا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ تخریب کار پکڑے کیوں نہیں جاتے؟ اس کے ابو آغا صاحب پولیس کے اعلیٰ افسر تھے اور پولیس اکیڈمی۔ انسٹرکٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دھماکوں کے سلسلے میں دو تخریب کار گرفتار کیے گئے مگر ان کی رہائی کے لیے سفارشیں آنے لگیں۔ ذیشان اپنے ابو کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ اُن میں سے ایک بلی آنکھوں والا اور دوسرا عام سا آدمی تھا۔ اُن دونوں کو بالآخر انسپکٹر احمد نے رہا کر دیا۔ شام کو ذیشان اپنی سائیکل پر جا رہا تھا کہ اُسے بلی آنکھوں والا کار سے اُتر کر جاتا نظر آیا۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور اُس کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ شخص ایک اسٹور سے "بلیک مین" پرفیوم خرید کر گاڑی میں چلا گیا۔ ذیشان واپس گھر چلا۔ راستے میں اُس کی سائیکل ایک

موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی، جس سے وہ دونوں گر گئے۔ گھر پہنچ کر ذیشان کو پتہ چلا کہ اُس کی جیب میں ڈائری نہیں ہے۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اُس کی سائیکل سے ٹکرانے والا آدمی وہی تھا، جسے اُس نے بلّی آنکھوں والے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگلے دن کوئی آدمی ڈائری واپس کر گیا۔ ذیشان فوراً سائیکل لے کر اُس کی تلاش میں نکلا اور بالآخر اُس تک جا پہنچا۔ وہ شخص اُس سے بڑی اپنائیت سے باتیں کرنے لگا۔ مگر ذیشان مسلسل خطرے کی بُو محسوس کر رہا تھا۔ اور اُس کا اندازہ درست ثابت ہُوا۔ کیوں کہ اُن کی باتوں کے دوران ایک جیپ اُن کے پاس آکر رُکی اور دو آدمیوں نے ذیشان کو قابو کر کے اُسے گاڑی میں ڈال دیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اُسے "بلیک مین" خوشبو کا جھونکا محسوس ہُوا۔ آغا صاحب کو ذیشان کی گمشدگی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوری طور پر اُس کی تلاش شروع کروادی۔ لیکن اُس کا کوئی سُراغ نہ مِلا۔ پھر ایک دن وہ بڑی خاموشی سے واپس آگیا۔ آغا صاحب اور پولیس کے افسران، اُس سے معلومات کرنے لگے۔ مگر ذیشان کوئی خاص بات نہ بتا سکا۔ وہ اپنے طور پر بھی اُس جگہ کا سُراغ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا، جہاں اُسے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ یکایک فون کی گھنٹی بجی اور نامعلوم شخص نے

آغا صاحب کو دھمکی دی کہ وہ ان کے راستے سے ہٹ جائیں، ورنہ خطرناک نتائج کے لیے تیار رہیں۔ اس کال کے بعد ایسی تمام جگہوں کی نگرانی کا فیصلہ کیا گیا، جہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اس کے اگلے دن لاہور کے ایک دینی جلسہ عام میں بموں کے دھماکے ہوئے اور بہت سے لوگ اور عالم دین شہید ہو گئے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد کراچی کے بازار میں دھماکہ ہو گیا۔ ایک افسر نے شک ظاہر کیا کہ جو بھی فیصلے کیے جاتے ہیں تخریب کار اُن سے کسی طرح آگاہ ہو جاتے ہیں، لہٰذا اس بات کا پتا لگانا چاہیئے کہ وہ کس طرح میٹنگ کی گفتگو سُنتے ہیں۔ ذیشان چھپ کر یہ ساری باتیں سُن رہا تھا اور دل میں فیصلہ کیا کہ وہ خود تخریب کاروں کا کھوج لگائے گا۔ اس شک کے بعد کہ مجرم میٹنگ کی کارروائی سُن لیتے ہیں، آغا صاحب کے گھر اور ملازمین کی تلاشی لی گئی، مگر کچھ نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ جدید ترین آلات سے لیس تلاشی پر مامور انسپکٹر شعیب نے شک ظاہر کیا کہ ٹرانسمیٹر ذیشان کے پاس ہے۔ آغا صاحب نے بڑی چالاکی سے ذیشان کی تلاشی لی، مگر اُس کے پاس سے کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔ آغا صاحب نے یہ بات انسپکٹر شعیب کو بتائی تو اُسے شک ہُوا کہ آغا صاحب اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں، تلاشی اُسے خود لینی چاہیے تھی۔

تلاشی لی، مگر اُس کے پاس سے کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔ آغا صاحب کو شک ہُوا کہ ذیشان کہیں تخریب کاروں سے نہ مِل گیا ہو۔ ایک دن جب بیماری میں انہوں نے کیپسول کھایا تو یہ مسئلہ فوری طور پر حل ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ ذیشان کے جسم میں بھی اسی طرح کا کوئی مائیکرو ٹرانسمیٹر کیپسول چھپایا گیا ہے، جس سے وہ لاعلم ہے۔ خصوصی آلے کی مدد سے چیک کرنے پر یہ شک درُست ثابت ہُوا۔ اُس کے بعد آغا صاحب نے میٹنگ کی جگہ بدل دی اور خصوصی کمیٹی کو ایک گرینڈ پلان تیار کرنے کی ہدایت کی۔ ذیشان اپنے دوست طارق کے گھر میں کھیل رہا تھا کہ اُس کے نام کال آئی اور نامعلوم شخص نے اُسے دھمکی دی کہ اگر اپنے باپ کی زندگی چاہتے ہو تو گرینڈ پلان والی فائل کی فوٹو کاپی بنوا کر ہمارے حوالے کر دو، ورنہ تمہارے باپ کو بم سے اُڑا دیا جائے گا۔ ذیشان اپنے ابو کی جان کے بدلے اس کام پر رضامند ہو گیا اور فائل چُرا کر گھر سے قریب ترین فوٹو اسٹیٹ کی دُکان پر پہنچا۔ ابھی فائل کی فوٹو کاپی بن رہی تھی کہ دُکان میں بلیک مین خوشبو کا جھونکا آیا اور بلّی آنکھوں والا بہروپ نُما آدمی اندر داخل ہُوا۔ فائل کی ساری نقول اُس نے خود لے لیں اور بل ادا کر کے سُرخ بجیرو میں بیٹھ کر چلا گیا۔ ذیشان گھر واپس آیا اور فائل دوبارہ اپنی جگہ رکھ دی۔ اگلے دن وہ طارق کو لے کر اُس علاقے کی تلاش میں نکلا، جہاں اسے اغوا کر کے رکھا گیا تھا۔ کافی تلاش کے بعد اُسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔ اُسے ایک بنگلے میں وہی سُرخ بجیرو کھڑی نظر آئی۔ اُس نے تخریب کاروں کے اڈّے کا پتہ چلا لیا تھا!

ایک دن صبح سویرے ذیشان کے گھر میں فون کے ذریعے اطلاع ملی کہ آغا صاحب کو ایک اہم فائل کی فوٹو اسٹیٹ تخریب کاروں کے حوالے کرنے پر گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ذیشان اپنے ابو سے ملا تو انہوں نے اسے تسلی دی۔ اپنے وکیل کو انہوں نے بتایا کہ انسپکٹر احمد نے انہیں پھنسانے کی کوشش کی ہے کیونکہ وہ تخریب کاروں سے ملا ہُوا ہے۔ مگر جس فائل کی فوٹو اسٹیٹ ذیشان نے کروائی وہ بھی نامعلوم افراد ان کے ہاں سے لے اُڑے۔ آغا صاحب کی ضمانت بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اسی دوران انسپکٹر احمد کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس طرح کیس آغا صاحب کے خلاف مزید اُلجھ گیا۔ ایک دن ذیشان نے انہیں بتایا کہ وہ تخریب کاروں کے ملنے کی جگہ جانتا ہے جو سیکٹر زیڈ میں واقع ہے۔ انہوں نے اُسے سختی سے تاکید کی کہ وہ ان کے باہر آنے تک اس واقع کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اسی دوران ان کے وکیل نے انہیں خوشخبری سُنائی کہ اگلی صبح ان کی ضمانت ہو جائے گی۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

آغا صاحب نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"میں ذیشان کی طرف سے پریشان ہوں۔ تخریب کار کہیں اُسے نقصان نہ پہنچائیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ لوگ اُسے پہلے بھی اغوا کر چکے ہیں۔ اس کے جسم کے اندر ٹرانسمیٹر موجود ہے اور اس کے گلے میں ہم نے ایک لاکٹ بھی ڈالا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ لاکٹ کے سگنل ریسیور کو باقاعدہ واچ کیا جائے تاکہ خبر رہے کہ ذیشان کہاں ہے اور کیا وہ خطرے میں تو نہیں تاکہ خطرہ ہونے کی صورت میں پولیس اس کی امداد کو پہنچ سکے۔"

"رائٹ سر!" انسپکٹر شعیب نے آغا صاحب کو سلوٹ کیا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

ابھی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ انسپکٹر شعیب کا فون آیا۔

"سر! معذرت کے ساتھ ایک خبر ہے کہ۔۔۔"

"ہاں ہاں! بولو کیا ہے؟ جلدی بتاؤ لڑکے!"

"سر! مجھے کہا گیا ہے کہ میں ذیشان اور طارق کو گرفتار کر لوں۔"

"تو پھر تم نے کیا سوچا!" آغا صاحب نے انسپکٹر شعیب سے پوچھا۔

"سر!" انسپکٹر شعیب نے۔۔۔ ادب سے کہا۔" بھلا میں یہ کیسے کر سکتا ہوں میں نے۔۔۔ سوچا کہ آپ سے بات کر لوں۔"

"سنو لڑکے!" آغا صاحب نے انسپکٹر شعیب سے پیار سے کہا۔" یہ زیادہ مناسب ہے کہ تم ان دونوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھو مجھے اُمید ہے کہ صبح میری ضمانت ہو جائے گی۔ ابھی وکیل صاحب نے مجھے کاغذات دکھائے ہیں اور تفصیل بھی بتائی ہے اور پھر ذیشان کی طرف سے مجھے جو پریشانی ہے، وہ بھی دُور ہو جائے گی۔ ذیشان اور طارق کا گرفتار ہونا بہت ضروری ہے۔ بس تم یہ کرنا کہ میری بیگم اور طارق کے گھر والوں سے کہنا کہ ان دونوں کو میں نے اپنے پاس بُلوایا ہے۔ باہر ان کی جانوں کو خطرہ ہے۔"

"رائٹ سر!" شعیب نے کہا اور آغا صاحب نے "شاباش لڑکے" کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

چند ہی لمحوں بعد انسپکٹر شعیب کا پھر فون آیا کہ ذیشان اور طارق دونوں گھر پر موجود نہیں اور گھر والوں کو بھی ان کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ وہ کہیں چپکے سے نکل گئے ہیں اور گھر والے نہایت پریشان ہیں۔ انسپکٹر شعیب نے ایک ہی سانس میں ساری معلومات فراہم کر دیں۔

"لڑکے!" آغا صاحب نے انسپکٹر شعیب کو جلدی سے کہا۔

"فوری طور پر لاکٹ کے سگنل ریسیور کو آن کرو اور دیکھو ذیشان کہاں ہے۔"

"سر! میں نے آتے ہی چیک کیا تھا۔ وہ سیکٹر زیڈ میں کسی جگہ موجود ہے۔ میں اس کی تلاش میں جانے والا تھا کہ سوچا آپ کو اطلاع کر دوں!"

"دیکھو لڑکے!" آغا صاحب نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔" میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، جو تمہیں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔ تم فوراً میرے پاس چلے آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر شعیب آغا صاحب کے پاس موجود تھا۔

آغا صاحب نے اُسے پوری تفصیل بتائی۔ "سیکرٹ زیڈ کے کسی مکان میں ذیشان کے بقول تخریب کاروں کا ہیڈ کوارٹر ہے جہاں بھاری تعداد میں کرنسی نوٹ، اسلحہ، آتشیں مادّہ اور بم وغیرہ موجود ہیں اور پورے ملک کے دھماکوں کا سرچشمہ وہی ہے اور میرا خیال ہے کہ ذیشان اور اس کا دوست اسی بنگلے کے اردگرد کہیں موجود ہوں گے میں نے اُنھیں منع کیا تھا لیکن غالباً وہ سمجھتا ہے کہ پولیس یہ کارنامہ انجام نہیں دے سکتی اور پولیس کے اندر کئی ایک انسپکٹر احمد موجود ہیں۔۔۔۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ کسی خطرے میں نہ پھنس جائے اس لیے فوری طور پر سیکرٹ زیڈ کا محاصرہ کر لو اور سگنل کی مدد سے ذیشان کی تلاش کرو۔ کوشش کرنا جھڑپ نہ ہو اور اردگرد کے مکانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے"!

● اندھیرا پھیل چکا تھا۔ طارق اور ذیشان تخریب کاروں کے ہیڈ کوارٹر کے گرد گھوم رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ آج اس بنگلے میں ضرورت سے زیادہ ہی آمد و رفت ہے۔ گاڑیاں آ رہی تھیں۔ ہر گاڑی کی آمد پر دروازہ کھلتا۔ بہت احتیاط سے گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے شخص کو چیک کیا جاتا اور گاڑی اندر چلی جاتی اور دروازہ بند ہو جاتا۔ کوئی بھی گاڑی گیٹ سے باہر نہ تھی۔ اتنی گاڑیاں اندر جا چکی تھیں کہ ذیشان حیران تھا کہ اندر اتنی گاڑیاں کہاں کھڑی کی گئی ہوں گی۔

"لگتا ہے آج کوئی اہم اجلاس ہے اور ملک کے تمام تخریب کار یہاں جمع ہیں"۔ ذیشان نے طارق کی طرف دیکھا اور ایک کاغذ پر لکھ کر اُسے کہا۔ "میں تو اس بنگلے کے اندر جا رہا ہوں اگر کوئی پولیس والا آئے اور میرا پوچھے تو اُسے اس بنگلے کا پتہ بتا دینا اور خود گھر چلے جانا۔ خطرے کی صورت میں میں لاکٹ کا یہ بٹن دبا دوں گا اور مجھے اُمید ہے کہ کوئی نہ کوئی میری مدد کو ضرور پہنچ جائے گا اگر دیر ہو جائے اور کوئی نہ آئے تو تم اس ٹیلیفون پر انسپکٹر شعیب کو سب کچھ بتا دینا"۔ طارق نے سب کچھ پڑھ کر ذیشان کو اشاروں ہی اشاروں میں منع کرنے کی کوشش کی لیکن ذیشان اندر جانے پر بضد تھا۔

ذیشان اور طارق نے اپنی سائیکلیں پہلے ہی ایک جگہ چھپا دی تھیں۔ دونوں بنگلے کی پچھلی طرف گئے اور دیوار پھلانگنے کا کوئی راستہ دیکھنے لگے۔ ذیشان نے دیکھا کہ دیوار پھلانگنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ دیوار سے نصب پائپ اور پھر ایک درخت جو بنگلے کے اندر ہے پائپ کے ذریعے اُوپر چڑھ کر اُسے درخت کی ٹہنیاں پکڑ کر اندر کود پڑے گا۔

ذیشان نے اپنی جیب میں ماچس کو چیک کیا اور پائپ کے ذریعے اُوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ اُسے جس دن سے اس بنگلے کا پتہ چلا تھا وہ ماچس جیب میں رکھنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماچس کی ایک تیلی سے وہ تمام تخریب کاروں کو آگ میں جھونک دے گا۔

جب اُس نے درخت کی ٹہنیوں کو پکڑ لیا تو طارق نے محسوس کیا کہ کوئی اس سمت آ رہا ہے... وہ فوراً دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اور زمین پر گری چھوٹی موٹی چیزوں کو ٹھوکریں مارتا سگریٹ کا کش لیتا وہ اس کے پاس سے گزر گیا۔ طارق نے محسوس کیا کہ وہ ٹھوکریں مار نہیں رہا بلکہ ٹھوکریں کھا رہا ہے کیونکہ وہ نشے میں تھا۔ طارق نے اوپر دیکھا۔ ذیشان سانس روکے درخت کی ٹہنیوں سے چپکا ہوا تھا۔ اور آہستہ آہستہ تنے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ کودنے کی بجائے تنے کی جانب آہستہ سے اُترنا چاہ رہا تھا تاکہ کودنے کے شور سے کسی کو پتہ نہ چل جائے جب ذیشان آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو طارق نے اپنی سائیکل نکالی اور بڑی سڑک پر سائیکل چلانے لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے باوجود اُس کو پسینہ آ رہا تھا۔ اس سے سائیکل چلائی نہیں جا رہی تھی وہ کبھی کھڑا ہو جاتا اور کبھی چین ٹھیک کرنے لگتا وہ سوچ رہا تھا کہ جلد از جلد کوئی پولیس والا آ جائے تاکہ وہ اسے ذیشان کے بارے میں بتا دے۔

● انسپکٹر شعیب کے جاتے ہی آغا صاحب نے جمیلہ سے کہا کہ اگر وہ انھیں اجازت دے دے تو وہ وعدہ کرتے ہیں کہ اپنی جان پر کھیل کر بھی وقت پر واپس جیل پہنچ جائیں گے۔

"آغا صاحب!" جمیلہ نے کہا: "آپ میرے استاد ہیں لیکن اگر آپ میری جگہ ہوتے تو بتائیے آپ کا کیا جواب ہوتا؟"

"میرا جواب تو تمھیں معلوم ہے۔" آغا صاحب نے جواب دیا۔

"تو آغا صاحب میرا جواب بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیئے!"

"اس کے باوجود لڑکے! میں تو جاؤں گا۔"

"اور میں جہاں تک ممکن ہو سکے گا روکنے کی کوشش کروں گا۔" جمیلہ نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

"تمھیں معلوم ہے۔" آغا صاحب نے کہا: "میرے بیٹے کی جان خطرے میں ہے۔"

"اس کے باوجود آغا صاحب میں اپنے بچوں کو بھوکا نہیں مار سکتا۔" جمیلہ نے سپاٹ لہجے میں کہا آغا صاحب نے دروازے کی طرف دیکھا اور ابھی باہر نکلنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ جمیلہ نے پستول نکال لیا۔

"آغا صاحب آپ مجھے گولی چلانے پر مجبور نہ کریں۔"

"لڑکے!" آغا صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا: "بات صرف میرے بیٹے کی نہیں ہے بلکہ اس وقت میرا بیٹا تخریب کاروں کے چنگل میں ہے۔ اگر تم میرے راستے میں رکاوٹ بنے تو تم تخریب کاروں کا ساتھ دو گے اور اگر میرے ساتھ چلو تو تخریب کاروں کے دشمنوں کا ساتھ دو گے۔ میرا کہنا مانو۔ تم بھی میرے ساتھ چلو! یہ تمھارے مستقبل کے لیے بہتر رہے گا۔"

"آغا صاحب۔ مجھے بے حد افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھ پر آپ کی کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ آپ خاموشی سے اپنی کوٹھڑی میں چلے جائیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے آپ کو اپنے دفتر میں ٹیلی فون سُننے کے لیے بُلا لیا۔ آپ میری نوکری کا خیال کریں۔"

"میں تمھاری نوکری کا خیال کروں، یا ملک کا خیال کروں۔" آغا صاحب یکدم غُصّے میں آ گئے اور دوسرے ہی لمحے ان کی ٹانگ لگنے سے جیلر کا پستول فرش پر تھا اور آغا صاحب نے اُٹھانے میں دیر نہیں کی۔ انھوں نے جیلر کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اُس کے دفتر میں پڑے ایک کپڑے سے منہ بند کر دیا۔ دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر ہتھکڑی لگا دی جو جیلر کی اپنی ہی میز پر پڑی تھی۔ اور پھر وہ ہتھکڑی میز کے ساتھ باندھ دی جیلر نے اپنے لیے ایک سوٹ جوڑا کپڑوں کا غالباً نماز کے لیے دفتر میں رکھا ہوا تھا آغا صاحب نے اپنے جیل کے کپڑے اُتار کر وہیں پھینکے اور جیلر کے کپڑے پہن کر دفتر سے باہر نکل آئے۔ دفتر کو باہر سے بند کر دیا اندر ٹیلیفون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ آغا صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھا ایک طرف پولیس موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ آغا صاحب نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور جیل سے باہر نکل گئے گیٹ پر سیکورٹی گارڈ نے آغا صاحب کو ضمانت کی مُبارک باد دی۔

وہ تو کچھ دیر بعد ساری صورتِ حال سامنے آئی جب جیلر نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پولیس کے آدمیوں نے دروازہ کھولا۔ اس کے بعد فوراً آغا صاحب کا تعاقب شروع کیا گیا لیکن ان کا کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

● ذیشان نے اپنے پاؤں زمین پر رکھے تو کتّوں نے بنگلے کو سر پر اُٹھا لیا۔ رات کی خاموشی میں ان کے بھونکنے کی آواز نے ذیشان کو دہلا دیا۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا یا رونے لگتا لیکن اُس نے اللہ سے دُعا مانگی "یا اللہ مجھے حوصلہ دے اور مجھے طاقت دے کہ میں تیرے دشمنوں کے سامنے بہادری سے لڑ سکوں۔ اپنے ابّو کو بچا سکوں اور اپنی پاک سرزمین کو ان تخریب کاروں سے پاک کر سکوں"۔ دل میں اس دُعا کے جاگتے ہی اس کے پورے جسم میں ایک انجانی طاقت آ گئی تھی اور وہ بھاگ کر ایک راہداری سے ہوتا ہوا ایک دروازے سے اندر گھس گیا۔ دروازے سے اندر ہوتے ہی کتّوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ کلاشنکوف اُٹھائے کچھ ڈاکوؤں جیسی شکلوں والے لوگوں نے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کیا۔ لیکن کتّوں کی آوازیں بند ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی کہیں دبک گئے۔

ذیشان نے اپنے اِرد گرد کا جائزہ لیا اور ایک طرف کو راستہ پا کر آہستہ آہستہ اُدھر بڑھنے لگا۔ ایک طرف سے کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ذیشان آوازوں سے دُور رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُسے علم تھا کہ آوازوں کی مدد سے تخریب کاروں کو پتہ چل جائے گا کہ وہ کہاں ہے، پھر اُس نے سوچا۔ "یہ سب لوگ جو اکٹھے ہیں

توشاید میرے جسم کے ٹرانسمیٹر کے سگنل کو کوئی واچ نہ کر رہا ہو۔" اس نے حوصلہ کر کے اس بڑے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو وہاں تقریباً پچاس افراد موجود تھے۔ عجیب وغریب خوفناک شکلیں۔ وہ سب انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔

ذیشان دھڑکتے دِل کے ساتھ ان کی گفتگو سُن رہا تھا۔ انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اس پوری گفتگو کو سمجھنا تو اس کے لیے ممکن نہ تھا لیکن ان کے انداز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی منصوبہ بندی کر رہے ہوں۔

یکایک اُسے بلیک مین خوشبو محسوس ہوئی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے وہی بلّی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا سفید ریچھ اپنے خوفناک دانتوں کے ساتھ مُسکرا رہا تھا۔

● انسپکٹر شعیب لاکٹ سے نشر ہونے والے سگنل کی مدد سے سیکٹر زیڈ کی اس گلی تک پہنچ گیا تھا جس کے کونے پر طارق ابھی تک سائیکل کی چین درست کیے جا رہا تھا۔ انسپکٹر شعیب نے اپنی جیپ ٹھیک اس کے پاس کھڑی کی طارق انسپکٹر شعیب کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر رونے لگا۔

"انکل - وہ ذیشان !"

"کیا ہوا ذیشان کو ؟" انسپکٹر شعیب نے طارق کو تسلّی دیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اس بنگلے کے اندر چلا گیا ہے۔ اور کافی دیر سے واپس نہیں آیا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔" طارق نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

"ٹھیک ہے اب تمھارا کام ختم ہو گیا۔" انسپکٹر شعیب نے طارق کو شاباش دیتے ہوئے کہا اور ایک پولیس مین کو اشارہ کیا کہ وہ طارق کو اس کے گھر چھوڑ آئے اور پھر طارق سے مخاطب ہو کر کہا،

"اگر تم اپنے گھر سے باہر نکلے تو میں تمھیں تھانے میں لے جا کر بند کر دوں گا۔ سمجھے۔"

"ٹھیک ہے انکل۔" طارق نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے سیکٹر زیڈ کے تمام پولیس محاصرین کو وائرلیس پر اپنے نئے ٹھکانے سے باخبر کر دیا اور حکم دیا کہ آہستہ آہستہ تمام پولیس اس طرف آجائے۔ انھیں مزید ہدایت کی کہ عوام کو پولیس کی حرکات وسکنات کا قطعی علم نہ ہو۔ ابھی انسپکٹر شعیب اپنے کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ آغا صاحب موٹر سائیکل پر وہاں پہنچ گئے اور انسپکٹر شعیب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ (باقی آئندہ)

دو ٹکڑے کر دینے سے بھی نہیں مرتا

کینچوا وہ جاندار ہے، جس کے اگر دو ٹکڑے کر دیے جائیں تو بھی وہ نہیں مرتا، بلکہ سر والا حصّہ نشوونما پاتا رہتا ہے اور بالآخر پورا کینچوا بن جاتا ہے۔

ماہانہ مقابلۂ معلومات

سوال در سوال

اسامہ بن سلیم

ماھانہ مقابلۂ معلومات کے سلسلے کا تیسرا مقابلہ حاضر ہے۔ سوالات کو بغور پڑھیے۔ جوابات تلاش کیجیے اور جب آپ اپنے تئیں مطمئن ہو جائیں کہ تمام جوابات اور ان کا باہمی تعلق آپ کو معلوم ہو گیا ہے تو اُسے جواب کے کوپن نما صفحے پر لکھ کر ماہِ رواں کی ۲۰ تاریخ تک ہمیں بھجوا دیجیے... مقابلے میں شرکت کا طریقہ تو آپ جان ہی چکے ہیں تاہم نئے پڑھنے والوں کے لیے ہم یہ طریقہ ایک بار پھر بتا رہے ہیں۔

- تمام جوابات کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے، یہ تعلق کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا ہے، آپ کوپن میں جواب لکھ چکیں تو مستطیل نما خانے میں جو بھی ممکنہ تعلق آپ کی سمجھ میں آئے لکھ دیجیے۔
- جوابات اور ان کے تعلق کے علاوہ اپنا نام پتہ بھی صاف اور خوش خط لکھ دیجیے اور حاصل کردہ پوائنٹس کے دائرے کو ادارے کے استعمال کے لیے خالی چھوڑ دیجیے۔
- تمام جوابات درست ہونے کی صورت میں ایک ماہ کے فرق کے ساتھ آپ کا نام بھی شائع کیا جائے گا۔ اور قرعہ اندازی کے ذریعہ تین انعامات بھی دیے جائیں گے۔ جن میں پہلا انعام ۱۰۰ روپے (پرائز بانڈ یا پوسٹل آرڈر کی شکل میں) جب کہ دوسرا اور تیسرا انعام کتب یا رسائل کی صورت میں ہوگا۔
- مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن کا آنا ضروری ہے۔ فوٹو اسٹیٹ یا ہاتھ سے بنی ہوئی نقل قابل قبول نہ ہوگی۔
- جولائی کے شمارے میں شائع ہونے والے "سوال در سوال نمبر ا" کا نتیجہ بھی اس شمارے میں دیا جا رہا ہے۔ اس بار ہم ان ساتھیوں کے نام بھی شائع کر رہے ہیں جن کے ایک یا دو جوابات غلط تھے لیکن آئندہ ماہ سے صرف ایسے ساتھیوں کے نام شائع کئے جائیں گے جن کے تمام جوابات درست ہوں گے۔
- انعامات حاصل کرنے والے تینوں ساتھیوں کو انعامات روانہ کیے جا رہے ہیں۔ ادارہ انعام حاصل کرنے پر ان تینوں خوش نصیب ساتھیوں کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھیوں کے نام

پہلا انعام ۔ حمیرا نعیم ۔ لیاقت پور ۔ رحیم یار خاں
دوسرا انعام ۔ تابندہ شکیل ۔ پشاور کینٹ ۔ پشاور
تیسرا انعام ۔ ونودنی پردھانانی ۔ نواں کوٹ

(۱) دنیا کا پہلا اولمپک کس ملک میں کھیلا گیا ؟

(۲) اس مشہور فلسفی کا نام بتائیے جسے فیلسوف اوّل اور معلّمِ اوّل بھی کہا جاتا ہے۔ اس فلسفی نے مختلف علوم پر ۱۲۰ کتب لکھیں۔ عرصۂ حیات ۳۸۴ تا ۳۲۲ قبلِ مسیح ہے۔

(۳) مقدونیہ کے بادشاہ فلپ کے اُس بیٹے کا نام بتائیے جو دنیا کا عظیم فاتح اور جرنیل کہلایا؟

(۴) "مشہور باغات" .... دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک .... ؟ ان باغات کا نام بتائیے ؟

(۵) دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے میں واقع اُس عرب مُلک کا نام بتائیے جسے ایک زمانے میں "میسوپوٹیمیا" بھی کہا جاتا تھا ؟

(۶) برِّاعظم ایشیاء میں واقع اُس مُلک کا نام بتائیے جس پر ۱۹۲۱ء میں فوج کے ایک اعلیٰ افسر رضا خان نے قبضہ کیا؟

(۷) نصیر بُندا بین الاقوامی شہرت کے حامل ایک سابق پاکستانی کھلاڑی کا نام ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں ان کا تعلق کس کھیل سے تھا ؟

(۸) اس ایشائی ملک کا نام بتائیے جس نے خلائی تحقیقات کے لیے دو مرتبہ خلاء میں راکٹ بھجوانے کی کوشش کی اور دونوں مرتبہ ناکام رہا ؟

(۹) گیارہ روز تک لڑی جانے والی اس جنگ کا نام بتائیے جس میں پاکستان نے اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت کو شکست دی ؟

(۱۰) پاکستانی فضائیہ کے اُس سابق افسر کا نام بتائیے جس نے فضاء میں ہونے والے کسی بھی معرکے میں سب سے زیادہ جہاز گرانے کا ریکارڈ قائم کیا ؟

جوابات، سوال در سوال نمبر ۱ (ماہ جولائی)

(۱) "کام کام اور کام آپ یقیناً کامیاب ہو جائیں گے" یہ قول قائدِ اعظم محمد علی جناح کا ہے۔

(۲) پاکستان کا پہلا دارالخلافہ کراچی تھا۔

(۳) تحریکِ خلافت کے رُوحِ رواں، بلند پایہ خطیب شاعر اور نامور صحافی کا نام مولانا محمد علی جوہر تھا۔

(۴) خانۂ کعبہ سے قبل مسلمان بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔

(۵) فلسطین کو انبیأ کی سرزمین کہا جاتا ہے۔

(۶) سید قطب شہید اور حسن البنا شہید کا تعلق افریقی ملک مصر سے تھا۔

(۷) وکٹوریہ جھیل سے نکلنے والا طویل ترین دریا، دریائے نیل ہے۔

(۸) جلیلۃ القدر پیغمبر جو آگ کی تلاش میں نکلے اور پیغمبری کے منصب پر فائز ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔

(۹) من و سلویٰ قوم بنی اسرائیل پر اُتارے گئے۔

(۱۰) فلسطین اور مصر کو ملانے والی وادیٔ سینا کئی بار میدانِ کارزار بنی۔

جوابات کا باھمی تعلق

قائدِ اعظم کراچی میں پیدا ہوئے، یہاں پر ابتدائی تعلیم حاصل کی اور کراچی ہی میں مدفون ہیں۔

کراچی کے ایم اے جناح روڈ پر واقع خالق دینا ہال میں مولانا محمد علی جوہر پر مقدمہ چلایا گیا۔

مولانا محمد علی جوہر بیت المقدس میں مدفون ہیں۔

بیت المقدس فلسطین میں واقع ہے۔

فلسطین اور مصر ہمسایہ، عرب اور مسلمان ممالک ہیں۔ ان دنوں اسرائیل فلسطین پر قابض ہے، اسی ناجائز قبضے کے باعث کئی بار مصر اور اسرائیل کے مابین شدید جنگ بھی ہو چکی ہے۔

مصر کا مشہور دریا، دریائے نیل ہے۔ اسی لیے مصر کو تحفۂ نیل بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی پیدائش کے کچھ عرصے بعد فرعونِ مصر کی طرف سے قتل کیے جانے کے خوف کے باعث دریائے نیل میں بہا دیے گئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے یہ ایک معجزہ ہے کہ انہوں نے دریائے نیل پر حُکمِ خداوندی سے اپنے عصا کو رکھا اور دریا میں راستہ بن گیا۔ جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کا لشکر بخیریت گزر گیا جبکہ ان کا پیچھا کرنے والا فرعونی لشکر غرقِ آب ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قومِ بنی اسرائیل کے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔ بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اُمت تھی۔

قومِ بنی اسرائیل ۴۰ سال تک وادیٔ سینا میں بھٹکتی رہی اور یہیں ان پر من و سلویٰ اُتارا گیا۔

ماہانہ مقابلۂ معلوماتِ عامہ

۲	۱	جواب نمبر ۱ اور ۲ کا تعلق
۳		جواب نمبر ۲ اور ۳ کا تعلق
۴		جواب نمبر ۳ اور ۴ کا تعلق
۵		جواب نمبر ۴ اور ۵ کا تعلق
۶		جواب نمبر ۵ اور ۶ کا تعلق
۷		جواب نمبر ۶ اور ۷ کا تعلق
۸		جواب نمبر ۷ اور ۸ کا تعلق
۹		جواب نمبر ۸ اور ۹ کا تعلق
۱۰		جواب نمبر ۹ اور ۱۰ کا تعلق

مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن کا آنا ضروری ہے۔

حاصل کردہ نمبر

نام _____ مکمل پتہ _____

جہاں قالین وہیں صفائی

سنو وہائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس :

عبداللہ ہارون روڈ فون : ۵۱۱۷۱۱

شاخیں :

○ بہادر آباد فون : ۴۱۳۶۹۵	○ ڈیفنس فیز V فون : ۵۲۶۵۳۹
○ جمشید روڈ 〃 ۴۱۱۳۰۲	○ امیر خسرو روڈ 〃 ۴۱۳۶۹۵
○ کھارادر 〃 ۲۲۵۸۰۳	○ راشد منہاس روڈ 〃 ۴۱۱۳۰۲
○ گارڈن روڈ 〃 ۷۲۲۴۳۳	○ حسن اسکوائر 〃 ۵۲۶۵۳۹
○ برنس روڈ ۲۰۲۳۳۶	

سنو وہائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس : عبداللہ ہارون روڈ . کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹

زونل آفس : صدر بازار . راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

تمام سوالات کے درست جوابات دینے والے ساتھیوں کے نام

عطاء العلیم ۔ ربوہ ۔ ضلع جھنگ ۔ کاشف احمد خان ۔ ماڈل کالونی ۔ کراچی ۔ عدیل احمد ۔ نوکوٹ ۔ سندھ ۔ کاشف شکور عزل ۔ نظامانی روڈ ۔ سانگھڑ ۔ سید نوید علی ہاشمی ۔ سنجھورو ضلع سانگھڑ ۔ کوکب بزمی ۔ سعود آباد، کراچی ۔ منصور احمد، گڑھی شاہو، لاہور ۔ غلام حسین میمن، کھائی روڈ، حیدر آباد ۔ سید محمد طارق شاہ، شب قدر فورٹ پشاور ۔ مرتضےٰ علی خان، پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۔ خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال، کراچی ۔ سلوت شادمان، ملیر ہالٹ، کراچی ۔ ببلی بشیر، پولیس ہیڈکوارٹر، حیدر آباد ۔ مصلح الدین محمد، یونیورسٹی کیمپس، پشاور ۔ عاصم گل، جہانگیر پورہ، پشاور ۔ صبوحی بانو، کوثر ٹاؤن، ملیر، کراچی ۔ صفورا یاسین، مانسہرہ، ہزارہ ۔ تنویر خان، اے بی سی روڈ، فیصل آباد ۔ عنایت اللہ، کارساز، کراچی ۔ شہلا سلطانہ، لطیف آباد حیدر آباد ۔ ایاز بشیر، بی ایچ کیو، راولپنڈی ۔ محمد راشد، شہباز ٹاؤن، حیدر آباد ۔ نوشینہ گل، شو مارکیٹ کراچی ۔ سحر کاظم، پرانی وحدت کالونی، حیدر آباد ۔ مرزا توصیف بیگ، شاہی بازار حیدر آباد ۔ محمد آصف انظر، لاوہ، ضلع چکوال ۔ وقار حیدر شاہ، لانڈھی، کراچی ۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

نوید اعجاز، ٹنڈو آدم ۔ فاروق ارشد، مہران شوگر ملز، ٹنڈو الہ یار ۔ احسن اکرم، سیٹلائٹ ٹاؤن، بہاولپور ۔ آصف حشمت، تحصیل و ضلع کوہاٹ ۔ سید سجاد مہدی، فیڈرل بی ایریا، کراچی ۔ محمد معظم شاداب صدیقی، نارتھ کراچی، کراچی ۔ آصف محمود، راولپنڈی ۔ حسن مہدی خراسانی، انچولی، کراچی ۔ محمد سعید فیصل، سیٹلائٹ ٹاؤن، رحیم یار خان ۔ محمد فیصل وسیم، رحمان پورہ لاہور ۔ محمد عامر ایاز، لطیف آباد، حیدر آباد ۔ احسن وقار عباسی، مسلم ٹاؤن، راولپنڈی ۔ سید محمد عمر شاہ، حسینی روڈ، نواب شاہ ۔ اسامہ ممتاز، انڈس مہران ٹاؤن، کراچی ۔ رقیہ وحید بٹ، سیالکوٹ ۔ معراج فاطمہ، بنارس کالونی، میر پور میرس ۔ عبدالرحمٰن، شالامار ٹاؤن، لاہور ۔ نبیلہ اسلم، شالامار ٹاؤن، لاہور ۔ محمد امین سیف الملوک، سانگھڑ ۔ شہود علی، نئی کراچی چودھری ساجد حسین، رتن تلاؤ، کراچی ۔ سلمان خان سنبل، گورنمنٹ ڈگری کالج، بورے والا ۔ خالد عمر کامران، انور سوسائٹی، کراچی ۔ محمد عامر خان، راوی روڈ، لاہور ۔ ذوالفقار علی سمن آباد، لاہور ۔ تجمل الیاس، سمن آباد، لاہور ۔

دو غلطیاں کرنے والے ساتھیوں کے نام

عفاف یعقوب، چونا منڈی لاہور ۔ کاشف عزیز، عارف والا ۔ کھتری محمد عرفان، بجھور بازار، کراچی ۔ ایس اے عظیم، نیو کراچی، کراچی ۔ سید فاروق، حسینی روڈ، نواب شاہ ۔ خرم احمد پیرزادہ، گھارو، ضلع ٹھٹھہ ۔ جنید احمد، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی ۔ تزئین جاوید، نارتھ ناظم آباد، کراچی ۔ سلیم احمد، سرفراز کالونی، حیدر آباد ۔ محمد جمیل لطیف، شہباز کالونی، ٹنڈو الہ یار ۔ فرح رضوی اسلام آباد ۔ مقصود احمد صدیقی، اورنگی ٹاؤن کراچی ۔ شاہد محبوب، کہوٹہ، راولپنڈی ۔ مدیحہ قادری، نارتھ ناظم آباد، کراچی ۔ منظور احمد، نارتھ ناظم آباد، کراچی ۔ محمد فیصل، ناظم آباد کراچی ۔ محمد رفیق، گرومندر کراچی ۔ عزیز فاطمہ، اورنگی ٹاؤن، کراچی ۔ خالد خان، ہری پور ہزارہ ۔ شہنشاہ بابر خان، فاروق آباد، بہاونگر ۔ الیاس فاروق، انڈس مہران ٹاؤن، کراچی ۔ حارث وحید، رنگ محل، لاہور ۔ عباد علی سرفراز، ملتان روڈ، لاہور ۔ تحسین اللہ وزیر، بنوں شہر ذیشان احمد ذکریا، پی اے ایف بیس سرگودھا ۔ عظمیٰ حسین، واہ، ضلع راولپنڈی ۔ جاوید اقبال تارڑ، اقبال نگر، فیصل آباد ۔ سید شان الحق، ڈیگری، پشاور ۔ ساجد جمیل، لانڈھی، کراچی ۔ محمد عمر شاہ، مری روڈ، راولپنڈی ۔ حریم اعجاز، گلبرگ، کراچی ۔ جویریہ بخاری، پھٹن پٹوئی، پشاور ۔ رم تزئین، پھٹن پٹوئی، پشاور ۔ مدثر حسین جنید، میرپور آزاد کشمیر ۔ صائمہ سہیل، گلبرگ، لاہور

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلہ تحریر

اخلاق احمد کی مُہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

- بُرائیوں سے برسرِپیکار ۴، کمسن مجاہدوں کے کارنامے
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات
- خوبصورت اسکیچز ـــ بہترین تصاویر ـــ اعلیٰ طباعت

حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات

"حق اسکواڈ" حاصل کرنے کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوادیں

بارش چھم چھم ہوتی ہے

پروفیسر عنایت علی خان

آیا ہے برسات کا موسم بارش چھم چھم ہوتی ہے
سارے پیڑ وضو کرتے ہیں، کلیوں کا منہ دھوتی ہے
بارش چھم چھم ہوتی ہے

پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں اوپر تک تالاب بھرے ہیں
جن کے کنارے بارش ہو کر گھاس میں موتی بوتی ہے
بارش چھم چھم ہوتی ہے

اس کا رشتہ گر پوچھو تو ہم تم کو بتلاتے ہیں
بادل کی بیٹی ہے یہ اور نیل گگن کی پوتی ہے
بارش چھم چھم ہوتی ہے

جولائی میں بارش ہو تو کھیت کے وارے نیارے ہیں
فصل کے حق میں بچّو اس کا اک اک قطرہ موتی ہے
بارش چھم چھم ہوتی ہے

پانی کی بوچھاڑ میں بچّے خوش خوش خوب نہاتے ہیں
ابّو بھی آنگن میں کھڑے ہیں جسم پہ بس اک دھوتی ہے
بارش چھم چھم ہوتی ہے

بُوجھو تو جانیں بچّو! یہ ساون کی گھنگھور گھٹا
ٹھٹّے مار کے ہنستی ہے یا دھاڑیں مار کے روتی ہے
بارش چھم چھم ہوتی ہے

اس کی شرارت تو دیکھو بچّوں کو گرا کر کیچڑ میں
خود کپڑے گندے کرتی ہے اور پھر خود ہی دھوتی ہے
بارش چھم چھم ہوتی ہے

سفر آہستہ آہستہ

سید خورشید عالم

زمین پر انسانی سفر کی دلچسپ اور معلوماتی داستان

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ابتدائی زمانے میں جب ہوائی جہاز، ریل، کار حتیٰ کہ سائیکل تک ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت انسان کے لیے سفر کرنا کتنا کٹھن اور دشوار گزار مسئلہ رہا ہوگا۔ تب انسان بالکل پیدل چلتا اور سفر کے لیے مختلف حیوانوں کو استعمال کرنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں بعد میں آیا ہوگا۔

ابتدائی زمانے میں تو خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے والے انسان نے پیدل چلنا اور اپنا سامان پیٹھ پر لادنا شروع کیا ہوگا اور اندازے کے مطابق بعد میں سامان کھینچنے کے لیے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھٹوں کو باندھ کر ایک طرح کی "سلیج" بنائی گئی ہوگی۔ جو ایک طرح کا ذریعۂ نقل و حمل ہوگا۔

ذرائع نقل و حمل یعنی ٹرانسپورٹ کی دنیا میں سب سے بڑا انقلاب "پہیے" کی ایجاد تھا۔ بلکہ آج پہیے کو دنیا کی سب سے بڑی ایجاد کہا جاتا ہے۔ آج کسی کو بھی نہیں معلوم کہ اس اہم ایجاد کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ لکڑی کے گول ٹکڑوں یا درختوں کے تنوں کو بھاری وزن کے نیچے رکھ کر کھینچا گیا ہوگا۔ اس کا ثبوت مصوری کے قدیم نمونوں سے بھی ملتا ہے۔ ابتدائی زمانے کا انسان جس دور میں رہتا تھا وہ بڑا قدرتی اور فطری حسن سے مالا مال دور تھا۔ آہستہ آہستہ پھر انسان کے ذہن میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے ماحول سے ہٹ کر کسی دوسرے ماحول میں جائے۔ ایک اور مسئلہ بھی ابتدائی زمانے کے انسان کو پیش آیا اور یہ مسئلہ بڑے بڑے ندی نالوں اور دریاؤں کو عبور کرنے کا تھا۔ اس بارے میں ایک خیال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی ندی یا دریا میں گر گیا ہوگا اور ڈوبنے سے بچنے کے لیے لکڑی کا کوئی بہتا ہوا ٹکڑا پکڑ کر ڈوبنے سے بچ گیا ہوگا۔ یوں گویا لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے ابتدائی انسان نے ندیوں اور دریاؤں میں سفر کرنا شروع کیا۔ اسی طرح چھوٹے ندی نالوں کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لکڑی کے بڑے

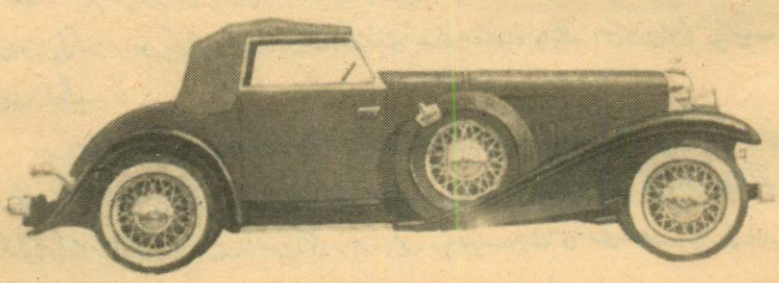

شتہیروں کو رکھ کر "پل" بنایا گیا۔

اس زمانے میں باربرداری کے لیے گھوڑے یا دوسرے جانور استعمال ہوتے تھے یا پھر انسان اپنا سامان خود ہی کھینچتا تھا۔ اس لیے لوگ زیادہ سے زیادہ اپنے گھر سے صرف چند کوس دُور سے زیادہ سفر نہیں کر پاتا تھا۔ اس کے بعد ضرورت یہ پیش آئی کہ ایک ہموار راستہ ہو جس پر سامان لانے اور لے جانے میں دِقت نہ پیش آئے۔ ابتداء میں کسی گاؤں سے دوسرے گاؤں کے درمیان جو راستہ یا سڑک بنائی گئی اُسے ہم آج کے دور کے لحاظ سے پگڈنڈی ہی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح تجارتی قافلوں کے سینکڑوں میل پر مشتمل راستے بھی آہستہ آہستہ بنتے چلے گئے۔

سفر بذریعہ سڑک :۔ اٹھارہویں صدی میں پہلی مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ مشینی طریقے سے پہیے کو چلایا جائے۔ کیوں کہ اس طرح وقت کی بچت بھی ہوگی اور فاصلہ بھی زیادہ طے ہوگا۔ اس سلسلے میں فرانسیسی فوجی افسر نکولس گگنوٹ نے ۱۷۶۹ء میں ایک تین پہیوں کی بھاپ سے چلنے والی گاڑی بنائی۔ اِدھر انگلستان میں ۶-۱۷۸۴ء میں ولیم مرڈوک نے بھاپ سے چلنے والی گاڑی پہلے ہی بنالی تھی۔ جو سامان کی ترسیل کے لیے نہایت موزوں تھی۔ مگر اس کے ادارے کے مالکان واٹ اور بولٹن اس تجربے سے اکتا گئے۔ اس لیے مرڈوک کو اس منصوبے پر کام بند کرنا پڑا۔ بعد میں وہ اپنے ایک دوست رچرڈ ٹریویتھک کے ساتھ ریل ٹرانسپورٹ کے منصوبے پر کام کرنے لگا۔ اسی لیے ان دونوں کو ریل کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

۱۸۲۰ء تک بھاپ سے چلنے والی بہت سی گاڑیاں بن چکی تھیں۔ ان بڑی گاڑیوں کے لیے نہایت ہموار راستے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ٹیلفورڈ اور مک ایڈم نامی دو سول انجینئروں نے سڑکوں کی تعمیر کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ ان گاڑیوں کی رفتار بیس میل فی گھنٹہ ہوتی تھی۔ اس زمانے میں یورپ میں صنعتی انقلاب آیا ہوا تھا اور کام کرنے والے افراد ایجاد ہونے والی ہر مشین کو اپنے روزگار کے لیے خطرہ سمجھ کر اسے تباہ و برباد کرنے پر تُل جاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود مشین سے چلنے والا پہیہ رُکا نہیں بلکہ چلتا ہی رہا۔ مگر ۱۸۶۵ء میں برطانیہ میں ایک قانون ایسا بنا جس نے وہاں اس صنعت کو ختم ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کی رُو سے لازم ہو گیا کہ شہر کے نواح میں گاڑی کی رفتار چار میل فی گھنٹہ اور شہر میں دو میل فی گھنٹہ ہو۔ اور یہ کہ ایک آدمی گاڑی کے آگے سرخ رنگ کا جھنڈا لہراتا ہوا چلے۔ اس قانون کا نام "ریڈ فلیگ ایکٹ" رکھا گیا۔

جدید موٹر کار کے بانیوں میں دو نام بڑے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ دونوں جرمنی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ایک کارل بینز اور دوسرا گوٹلب ڈیملر ہے۔ بینز نے ۱۸۸۵ء میں تین پہیوں والی کار بنائی جو پیٹرول سے چلتی تھی۔ جبکہ ڈیملر کی موٹر گاڑی ۱۸۸۶ء میں سڑک پر آگئی۔ ۱۸۹۶ء میں "ریڈ فلیگ ایکٹ" کی منسوخی کے بعد گاڑیوں کی رفتار

بارہ میل فی گھنٹہ ہو گئی۔ اس کے علاوہ لندن سے برائیٹن تک گاڑیوں کی سالانہ ریس کے مقابلے بھی منعقد ہونے لگے۔

۱۸۸۸ء میں بجلی سے چلنے والی کاریں بنائی جانے لگیں۔ یہ کاریں نہایت سُبک رفتار اور بے آواز ہوتی تھیں۔ مگر اس دور میں یہ مقبول نہ ہو سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں بڑی بڑی بیٹریاں لگی ہوئی تھیں جن کو وقفے کے ساتھ چارج کیا جانا ضروری تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی کاروں کی نئی اقسام ہر سال تیار ہونے لگیں۔ ۱۹۰۷ء میں دُنیا کی سب سے مہنگی کار رولس رائس بنائی گئی جسے "سلور گھوسٹ" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کار کا پہلا ماڈل ۱۹۳۹ء تک بہترین حالت میں چلتا رہا۔ اس وقت تک اس ماڈل نے چار لاکھ میل کا سفر طے کر لیا تھا۔ برطانیہ میں ولیم مورس اور امریکا میں ہینری فورڈ نے اچھی، سستی اور تیز رفتار کاروں کی تیاری میں بڑا نام کمایا۔ کاروں کی ریس کی وجہ سے بھی نئی نئی کاریں نت نئے ماڈل کا روپ دھار کر سامنے آتی رہیں۔ آج جاپان کاروں کی صنعت میں دُنیا بھر میں سب سے اوّل ہے۔ کیونکہ جاپانی کاریں سستی، ہلکی اور سُبک رفتار ہوتی ہیں اور پیٹرول کا خرچ بھی کم ہوتا ہے۔ جب کہ امریکن اور جرمن کاریں قیمت کے اعتبار سے آج بھی نہایت مہنگی سمجھی جاتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود مغربی جرمنی کے ایک شخص پیٹر کاز نے ۱۹۳ کاریں، جی ہاں سچ مچ کی کاریں جمع کر کے پوری دُنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ شوق کے آگے سب کچھ ہیچ ہے۔ اسی طرح مغربی جرمنی ہی میں فرینکفرٹ کے قریب اشنے فن برگ کے مقام پر حال ہی میں دُنیا کے سب سے بڑے ریسنگ اور اسپورٹس کار میوزیم کا افتتاح ہوا ہے۔ اس میں موجود ۱۹۳ کاریں چار بڑے بڑے ہالوں میں رکھی گئی ہیں۔ ان کاروں میں دُنیا کی مہنگی ترین کاریں بھی موجود ہیں۔ یہ تمام کاریں پیٹر کاز کی ذاتی ملکیت ہیں۔ جو اس نے گزشتہ چودہ سال میں جمع کی ہیں۔

سفر بذریعہ ریل: ریلوے کی تاریخ بھی سینکڑوں برسوں پر مشتمل ہے۔ وسطِ یورپ میں جہاں کوئلے کی کانیں تھیں وہاں گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے کوئلہ کھینچا جاتا تھا۔ جس سے زمین پر پہیوں کے گہرے نشان بن جاتے تھے۔ چنانچہ کسی نے یہ خیال پیش کیا کہ لکڑی کی لمبی لمبی پٹیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بچھا دیا جائے اور ان پر گاڑی گزاری جائے۔ اس طرح پہلی ریل گاڑی وجود میں آگئی۔

۱۸۰۴ء میں جنوبی برطانیہ میں "سرے آئرن ریلوے" قائم ہوئی۔ اسے صحیح معنوں میں پبلک ریلوے بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ صرف مال لاتی اور لے جاتی تھی اور اسے گھوڑے کھینچتے تھے۔ اسی سال ایک انگریز انجینئر رچرڈ ٹریوی تھک نے بھاپ سے چلنے والا انجن بنایا۔ تمام ریلوے انجینئروں میں جارج اسٹیفنسن اور اس کے بیٹے رابرٹ اسٹیفنسن کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے ریلوے ٹرانسپورٹ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اب مال کے ساتھ ساتھ انسان بھی ریل کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے لگے تھے۔ دونوں باپ بیٹوں نے ریل کے انجن تیار کرنے کے لیے ایک

ادارے کی بنیاد بھی رکھی۔ بھاپ سے چلنے والے انجن کی سخت مخالفت کے باوجود ۱۸۲۵ء میں اسٹاکٹن اینڈ ڈارلنگٹن ریلوے کا افتتاح ایک بڑی کامیابی ثابت ہوئی۔ یہاں پہلا انجن جارج نے خود چلایا جس میں اڑتیس بوگیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس انجن کی رفتار پندرہ میل فی گھنٹہ تھی۔ ۱۸۲۹ء میں ایک مقابلہ منعقد کرایا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مانچسٹر اور لیورپول کے درمیان چلانے کے لیے کون سا انجن سب سے بہتر رہے گا۔ اس مقابلے میں جارج اور رابرٹ کا "راکٹ" نامی انجن کامیاب ہوگیا۔ اس طرح دنیا میں پہلا مکمل ریلوے لیورپول اینڈ مانچسٹر ریلوے کہلایا کیوں کہ یہ باقاعدہ شیڈیول کے مطابق چلتا تھا۔ اس موقع پر جو لوگ اس انجن کی افتتاحی تقریب دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے انھوں نے ایک خوفناک حادثہ بھی دیکھا۔ ہوا یہ کہ لیورپول سے اسمبلی کے ایک رکن ولیم ہسکن "راکٹ" کی زد میں آکر کچلے گئے۔

بہت جلد پورے برطانیہ میں ریل کی سروس شروع ہوگئی۔ جارج اور رابرٹ نے یورپ اور امریکا کو بھی ریلوے انجنوں کے مختلف ماڈلز برآمد کیے۔ امریکا میں بھاپ سے چلنے والا انجن ۱۸۲۵ء میں جان اسٹیونس نے تیار کیا جب کہ فرانس میں بھاپ سے چلنے والا انجن مارک سیگوئین نے ۱۸۲۹ء میں تیار کیا۔ پورے یورپ میں ان دنوں صنعتی انقلاب آیا ہوا تھا اور نئے نئے رُوٹس قائم کرنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ بسا اوقات کمپنیاں راتوں رات دو دو اور تین تین ٹریک بچھا دیا کرتی تھیں۔

انیسویں صدی میں امریکا بھر میں ریل کی پٹڑیاں بچھا دی گئیں۔ ادھر روس میں بھی سینٹ پیٹرز برگ سے لے کر ماسکو تک چھ ہزار میل لمبی پٹڑی بچھا دی گئی۔

۱۸۶۰ء میں لندن میں پہلی زیرِ زمین ریلوے سروس کی تعمیر کا آغاز ہوا جو ۱۸۶۳ء میں کھول دیا گیا اب یورپ بھر میں زیرِ زمین سروس عام ہے۔ اب بھاپ سے چلنے والے انجنوں کا دور گزر چکا ہے۔ اب ڈیزل اور بجلی کی قوت سے چلنے والے انجن عام ہو چکے ہیں۔ تاہم کئی ملک میں اب بھی بھاپ سے چلنے والے انجن نظر آ ہی جاتے ہیں۔ آج ریلوے کو اپنے شعبے میں ہوائی جہازوں اور ٹرانسپورٹ سے سخت مقابلہ درپیش ہے۔ مگر سخت مقابلے کے باوجود ریلوے میں نت نئی اختراعات ہو رہی ہیں۔ اور اب تو سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاپان اور امریکا میں بھی ریلیں چل رہی ہیں۔

یہ تو تھا زمین پر انسان کے سفر کا حال۔ اگلے کسی شمارے میں ہم آپ کو بحری اور فضائی سفر کے بارے میں بھی ضرور بتائیں گے۔ خصوصاً انسان کے فضائی سفر کی کہانی کہ انسان جو پہلے چاند کو حسرت سے تکا کرتا تھا اب چاند کو تو تسخیر کر ہی چکا اب اس سے آگے کی جستجو ہے۔

نئی تحریریں

امتحان

مرسلہ ضمیر احمد جمیل ۔ کراچی

ہے امتحان سر پر لے ہو نہار بچّو!
کوشش کرو ذرا تم مردانہ وار بچّو!
اچھی نہیں ہے غفلت کب تک رہو گے غافل
کس بات کا ہے تم کو اب انتظار بچّو!
یہ وقت قیمتی ہے کچھ کام کر دِکھاؤ
موقع نہیں ملے گا پھر بار بار بچّو!
جو شوق سے کرے گا اپنی کمی کو پُورا ...
ہو گا اُسی کے دل کو حاصل قرار بچّو!
خوش ہوں گے تم سے اُس دن اُستاد سب تمھارے
ماں باپ بھی کریں گے جی بھر کے پیار بچّو!
اِس علم کی بدولت پہنچے گا فیض تم کو
لُوٹو گے زندگی کی آخر بہار بچّو!

احساس

محمّد عثمان، شادمان ٹاؤن، لاہور

امیر ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود جاوید میں غرور نام کو بھی نہیں تھا۔ وہ ہر ایک سے محبت اور عزت سے پیش آتا۔ یہی وجہ تھی کہ سارے لوگ اُسے پسند کرتے تھے۔ اور اُس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ جاوید کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر کسی کو بہت جلد اپنا دوست بنا لیتا تھا۔ اسی لیے جب علی اُن کی کلاس میں آیا تو جاوید اور اُس کی چند ہی دنوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ علی غریب والدین کا بیٹا تھا۔ اور پڑھائی کے بعد ایک جگہ

ملازمت بھی کرتا تھا۔ جاوید نے اُس کی غربت کے باوجود دوستی میں کبھی فرق نہیں رکھا اور نہ علی کو کبھی اُس کے غریب ہونے کا احساس دلایا۔

جاوید کی سالگرہ تھی اور اس نے دوسروں کے ساتھ علی کو بھی بلایا تھا۔ علی پریشان تھا کہ کیا کرے؟ کیوں کہ اُس کے پاس تحفہ خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے اور بغیر

تھیٹے کے وہ سانگرہ میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ علی مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ جائے یا نہ جائے۔؟ اسی اُدھیڑبن میں اُس نے اپنا بستہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ وہ بستہ جاوید کا تھا۔ جاوید نے ایک جیسے دو بستے خریدے تھے اور اُن میں سے ایک علی کو تحفتاً دیا تھا۔ بھول سے جاوید اُس کا بستہ لے گیا تھا اور وہ اُس کا بستہ اُٹھا لایا تھا۔ علی نے فوراً بستہ بند کیا اور اُسے کندھے پر ڈال کر جاوید کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا' جاوید کہیں پریشان نہ ہو رہا ہو۔

اُس نے جب جاوید کے گھر میں قدم رکھا تو اندر سے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ یہ جاوید کی بڑی بہن آسیہ باجی تھیں۔ آسیہ باجی کو غریبوں سے نہ جانے کیوں خدا واسطے کا بیر تھا۔ علی کے ساتھ بھی شروع دن سے اُن کا رویہ بے حد خراب تھا۔ اس لیے علی' جاوید کے گھر جانے سے کتراتا تھا اور حتی الامکان وہاں جانے سے گریز کرتا تھا۔ مگر آج تو ایسی بات ہو گئی تھی کہ اُسے جانا ہی تھا۔۔۔!

"میں نے پہلے ہی کہا تھا' وہ لڑکا اچھا نہیں ہے۔ یہ غریب لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اُس نے جان بوجھ کر تمہارے بستے سے اپنا بستہ بدل لیا ہوگا۔ تاکہ تمہارے سو روپوں پر ہاتھ صاف کر سکے!" آسیہ باجی بڑے غصے میں کہہ رہی تھیں۔

"نہیں باجی! ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے بہت جلدی تھی۔ میں ہی جلدی میں اُس کا بستہ اُٹھا لایا۔ اس کی کوئی غلطی نہیں ہے۔" جاوید نے صفائی پیش کی۔

"اُس نے والنتہ۔۔۔!" ابھی آسیہ باجی نے اتنا ہی کہا تھا کہ علی سر جھکائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر آسیہ باجی طنزیہ انداز میں کہنے لگیں۔ "آؤ آؤ' دھوکے باز تمہیں شرم نہ آئی' اپنے دوست کے پیسے۔۔۔!"

"میں جاوید کا بستہ واپس کرنے آیا ہوں۔ جلدی میں غلطی سے ہمارے بستے بدل گئے تھے۔" علی نے آسیہ باجی کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی تیزی سے کہا اور بستہ آسیہ باجی کی طرف بڑھایا۔

"دیکھو۔ اس میں سو روپے موجود ہیں یا اس نے نکال لیے۔" آسیہ باجی نے بستہ جاوید کو دیتے ہوئے کہا۔ جاوید نے علی پر نظر ڈالی۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا جیسے اُن کے فیصلے کا منتظر ہو۔ جاوید نے بے بسی سے آسیہ باجی کو دیکھا اور بستہ کھولنے لگا۔

"نوٹ موجود ہے۔" جاوید نے دھیرے سے اس طرح کہا' جیسے آسیہ باجی سے اس زیادتی پر احتجاج کر رہا ہو۔ جاوید کی بات سنتے ہی علی نے جھکا ہوا سر اُٹھایا اور آنسو بھری آنکھوں سے جاوید کو دیکھ کر پلٹ کے جانے لگا۔

"ٹھہرو علی!" آسیہ باجی کی آواز نے علی کے قدم روک دیے۔

"مجھے معاف کر دو علی۔ میں غلطی پر تھی۔ آج مجھے احساس ہوا کہ غریب بھی انسان ہوتے ہیں اور قابلِ احترام بھی' محض غربت کی وجہ سے کسی کو کمتر یا ہیچ نہیں سمجھنا چاہیئے۔" آسیہ باجی نے بڑی محبت سے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ علی گھوما اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھنے لگا۔ جاوید نے بھی قریب

آکر علی کے دوسرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ علی نے باری باری ان دونوں کو دیکھا اور آنکھیں پونچھ کر مسکرانے لگا۔۔۔!

کہانی ایک دن کی

عبدالوہاب، کراچی

آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں اپنے دوست خالد کے پاس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ خالد میرا سب سے اچھا دوست ہے، ہم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ تیار ہونے کے بعد میں سائیکل لے کر باہر نکل گیا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے میں سیٹی بجاتا ہوا مزے سے سائیکل چلانے لگا۔ خالد کا گھر کافی فاصلے پر تھا۔ ابھی میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ یہ صورتحال دیکھ کر میں نے سائیکل تیز چلانا شروع کر دی خطرہ تھا کہیں بارش تیز نہ ہو جائے۔ اور وہی ہوا، بارش اچانک تیز ہو گئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے ہی ایک بڑا سا درخت نظر آیا میں نے سائیکل درخت کے نیچے روکی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اگر درخت نہ ہوتا تو اس وقت کیا حال ہوتا؟ میں دعا کر رہا تھا، یا اللہ بارش رک جائے مگر بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ مجھے اس وقت اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا جس وقت میرے ذہن میں خالد کے گھر جانے کا خیال آیا تھا آخر خدا خدا کر کے بارش رکی میں نے وقت دیکھا تو پتہ چلا، چھ بج رہے ہیں میں۔۔۔ تیز تیز پیڈل مارنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ بارش کہیں دوبارہ نہ شروع نہ ہو جائے۔ آخر کار میں خالد کے گھر جا پہنچا اور گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی، انگلی بٹن سے چھوتے ہی میری زوردار آواز بلند ہوئی۔ کیونکہ اس وقت کال بیل میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا شاید میری چیخ اندر پہنچ گئی تھی۔ دروازے پر خالد کھڑا تھا۔

"کیوں اپنی بھونڈی آواز میں چیخ رہے ہو۔" خالد بولا۔

"کیا کہا بھونڈی آواز میں چیخ رہا ہوں ایک تو مجھے کرنٹ لگ گیا۔ اور پھر تمہاری گھنٹی خراب ہے۔ اوپر سے

کہتے ہو کہ بھونڈی آواز میں چیخ رہا ہوں۔"

"ارے بھائی گھنٹی خراب نہیں ہے بلکہ تمہاری عقل خراب ہے تمہیں پتا ہے، بارش ہوئی ہے" خالد نے کہا۔

"ہاں، ہوئی ہے۔" میں منہ بنا کر بولا۔

"کرنٹ تمہیں بارش کی وجہ سے لگا ہے" خالد نے گویا میری معلومات میں اضافہ کیا۔

"اچھا اب اندر بھی آنے دو گے۔ یا باہر ہی کھڑے کھڑے تقریر جھاڑتے رہو گے میں نے۔ تیزی سے کہا تو خالد شرمندہ ہو کر راستہ چھوڑ دیا۔ میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں

داخل ہوا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

"بیٹھو، میں تمہارے لئے چائے لے کر آتا ہوں" خالد نے کہا اور اندر چلا گیا۔ کافی دیر تک جب وہ نہ آیا تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں وہ اصلی چائے لانے کے چکر میں سیلون تو نہیں چلا گیا۔ کافی انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور خالد چائے بمیت نمودار ہوا۔

"ارے کہاں مر گئے تھے، چائے بنانے گئے تھے یا پائے"؟ میں غصے میں چلایا۔

"او بھائی دودھ ختم ہو گیا تھا دودھ لینے گیا تھا اس لئے دیر ہو گئی۔ آج تمہارا میٹر تو نہیں گھوما ہوا، جو بات بات پر ناراض ہو رہے ہو"۔

"جب گھر سے نکلا تو راستے میں بارش ہو گئی ایک گھنٹے تک پیڑ کے نیچے کھڑا سوکھتا رہا جب یہاں پہنچا تو کرنٹ لگا اور اب مابدولت اتنی دیر بعد چائے لے کر آ رہے ہیں اور اوپر سے پوچھتے ہیں، کیا بات ہے"؟ میں جلے بھنے انداز میں بولا۔

"اچھا یار چائے پیو چائے پیتے ہی تمہاری ساری ناراضگی دور ہو جائے گی۔ کیونکہ میں نے خود بنائی ہے"۔ خالد نے بڑے فخر سے کہا۔ میں نے کپ اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔ پھر فوراً ہی "آخ تھو" کہہ کر کپ نیچے رکھ دیا۔

"یہ کیا حرکت ہے، نامعقول انسان! نمک ملا کر لایا ہے چائے میں"! میں ہنستے سے اکھڑنے لگا۔

"سوری یار معاف کر دو، میں نے جان بوجھ کر تو نمک نہیں ملایا غلطی سے مل گیا ہو گا"۔ خالد نے ہنستے ہوئے وضاحت کی۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تم نے جان بوجھ کر نمک ملایا ہے"۔

"اچھا یار گولی مارو میں تمہارے لئے دوسری چائے لے کر آتا ہوں"۔

"رہنے دو، میں اب چلتا ہوں پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے"۔

"آؤ میں تمہیں گیٹ تک چھوڑ آؤں تم بھی کیا یاد کرو گے، کس رئیس سے پالا پڑا تھا"۔ خالد شاہانہ انداز میں بولا اور میں بری طرح جل گیا۔

"رئیس سے تو نہیں البتہ گدھے سے ضرور پالا پڑ گیا ہے" میں نے کہا! اور خالد بُرے بُرے منہ بنانے لگا۔

"ایک تو جب تم بُرے بُرے منہ بناتے ہو تو پتا نہیں کیوں مجھے الو یاد آنے لگتا ہے"۔

"دیکھو تم حد سے بڑھ رہے ہو، پہلے تم نے مجھے گدھے کا خطاب دیا اور اب الو کا" خالد بُرا مان گیا۔

"میں تو کہیں نہیں بڑھ رہا، صوفے پر ہی بیٹھا ہوں"۔

"تم تو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہو"، ایک بار پھر خالد کا منہ بن گیا۔ اب کی بار میں خاموش ہی رہا۔ ہم گیٹ کے پاس آئے۔

"ارے، میری سائیکل کہاں گئی؟"

"تم تو سائیکل لائے ہی نہیں تھے"۔

"نہیں بھئی ہمیں سائیکل پر ہی آیا تھا، مگر اسے باہر چھوڑ آیا تھا" میں فکرمندی سے بولا۔

"ارے تو اس میں فکر کی کیا بات ہے۔" خالد نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

"مگر میرے بھائی، سائیکل میں تالا ہی نہیں ہے۔ اسی لئے پریشان ہو رہا ہوں"

"پھر تو جلدی دیکھو، کہیں واقعی غائب نہ ہو گئی ہو۔"

"یار! ایسے اُلٹے سیدھے الفاظ تو منہ سے نہ نکالو" میں باہر قدم رکھتے ہوئے بولا۔ باہر دُور دُور تک میری سائیکل کے نام و نشان تک نہ تھا۔

"کہاں چلی گئی میری سائیکل۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟" مجھے پھر غصہ آنے لگا۔

"میاں! تمہاری سائیکل تو ہو گئی چوری اور باہر کھڑی کرو" خالد نے طنزیہ انداز میں کہا!

"ایک تو میری سائیکل چوری ہو گئی ہے، اُوپر سے تم طنز فرما رہے ہو" میرا پارہ چڑھنے لگا۔

"اچھا، اب بتاؤ، میں کیا کروں"؟ خالد نے پوچھا۔

"تم بیٹھ کر میری خیریت کی دُعا کرو" میں نے خبیدگی سے جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چلنے لگا۔ جب ایک گلی میں داخل ہوا تو وہاں کونے میں ایک کتا لیٹا ہوا نظر آیا۔ میں نے سوچا "یا اللہ خیر! آج کا دن کیسا خراب ہے۔ ہر طرف مصیبت ہی مصیبت ہے۔" میں کتے کے پاس گیا اور اس سے بولا "اے بھائی! راستے سے ہٹ جا، مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے" لیکن کتا ٹس سے مس نہ ہوا۔

"اچھا یہ بات ہے، نہیں ہٹے گا، سوچ لے، ہٹ جا نہیں تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ ساری عمر یاد کرتا پھرے گا"۔ شاید یہ بات کتے نے سُن لی کیونکہ اس کے فوراً بعد وہ مجھے اپنی اپنی لال لال آنکھوں سے گھورنے لگا۔

"ارے گھور کیوں رہا ہے کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں" میں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، پھر میں نیچے جھکا، پتھر اٹھایا اور کتے کو دے مارا!....

اور پھر میرے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ کتا میرے پیچھے لگ گیا میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا میں آگے آگے کتا پیچھے پیچھے، بھاگتے بھاگتے مجھے ایک گھر کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا میں تیزی سے اندر گھس گیا سامنے سے ایک صاحب آ رہے تھے، میں بھاگتا ہوا ان سے بڑے زور سے ٹکرایا اور ہم دونوں بڑے آرام سے فرش پر لمبے لمبے لیٹ گئے۔ اسی وقت اندر سے ایک عورت کی آواز آئی۔

"ارے مرزا صاحب! کیا قیامت آ گئی" شاید انہوں نے ہم دونوں کی ٹکرانے کی آواز سن لی تھی۔

مرزا صاحب بولے "بیگم! قیامت تو نہیں آئی مگر ایک چور ضرور آ گیا ہے" انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا! "اور ہاں تو میاں! تم ہمارے گھر میں کیا چوری کرنے آئے تھے۔؟" مرزا صاحب نے سوالات کا آغاز کیا۔

"مرزا صاحب کتا.....!"

"کتا، مجھے کتا کہا! بدتمیز، نالائق، بے شرم" مرزا صاحب آپے سے باہر ہو گئے فل اسٹاپ لگائے بغیر بولتے چلے گئے۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے دو ہاتھ بھی رسید کر دیئے

"جی وہ کتا میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ آپ کے گھر کا دروازہ کھلا نظر آیا اس لئے میں یہاں گھس گیا اب آپ ہی بتایئے، اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے ساری بات ایک ہی سانس میں کہہ ڈالی کہ کہیں مرزا صاحب ایک دو ہاتھ اور رسید نہ کر دیں۔

"ارے بیٹا معاف کرنا مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے پیچھے کتا لگ گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں انکل" میں نے بڑی فراخدلی سے انہیں معاف کر دیا۔

"میں نے تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔ کیا نام ہے تمہارا؟" مرزا صاحب بولے۔

"جی، ناصر!" میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"آؤ بیٹے ناصر! میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں۔" مرزا صاحب نے پیش کش کی۔

"رہنے دیجئے انکل! یہاں سے میرا گھر قریب ہی ہے میں چلا جاؤں گا۔" میں نے انہیں ...... روک دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا جب میں گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی مجھے اپنی سائیکل کھڑی نظر آئی پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، مگر جب اپنے چہرے پر تھپڑ لگایا تو تھوڑی ہی دیر میں یقین آ گیا۔ کیونکہ تھپڑ کچھ زور سے پڑ گیا تھا میں نے امی کو آواز دی۔ امی دروازے پر آئیں۔

"ارے ناصر بیٹا! تم آ گئے۔"

"جی امی میں تو آ گیا ہوں مگر یہ بتایئے کہ میری سائیکل یہاں کیسے آئی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بیٹا، تمہارا دوست عاصم رکھ گیا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ ناصر نے بھجوائی ہے اور یہ تم نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟" امی حیرت سے بولیں۔ میں نے ساری تفصیل ان کے گوش گزار کی۔

"اچھا امی، میں، ابھی آتا ہوں" ساری روداد بیان کر کے میں نے واپس جانے کے لئے قدم اٹھائے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" امی نے پوچھا۔

"ذرا عاصم کی خبر لے آؤں۔"

"ارے بیٹا! پہلے کپڑے بدل لو پھر خبر لے آنا" امی نے کہا۔ اور میں مسکین سی صورت بناتا ہوا غسلخانے میں چلا گیا۔

کیا آپ جانتے ہیں

- بتایئے: پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "نشان حیدر" کس سے بنایا جاتا ہے؟
- کیلنڈر کس زبان کا لفظ ہے؟
- بتایئے اردو میں ہندوستان کی تاریخ سب سے پہلے کس نے لکھی؟
- اس پہلی خاتون کا نام بتایئے، جس نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کی؟
- بتایئے "ابلیس" کس زبان کا لفظ ہے؟
- بتایئے جرمنی اور برما کے لوگ مسٹر کی جگہ کیا استعمال کرتے ہیں؟
- لفظ اردو سب سے پہلے کس نے استعمال کیا؟
- روس میں ریل گاڑی کو کیا کہتے ہیں؟

جوابات

• گن میٹل سے، جو کہ دشمنوں کی چھینی ہوئی گن سے حاصل کی جاتی ہے • لاطینی زبان کا • مولوی ذکاء اللہ • مسز جنکو تابی • عبرانی زبان کا • HERR جیسے ہر ہٹلر اور جیسے اونتانٹ • مصحفی نے • میرو • ... .کوٹ ادو

بچّوں کی خبریں

رضیہ محمّد، کوئٹہ

السّلام علیکم!... سب سے پہلے اہم خبروں کا خلاصہ...!

مالٹا کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا ہے اور کیلے نے حکومت سنبھال لی ہے۔ جانوروں کی منڈی کے ایک گنجان حصّے میں بم پھٹنے سے سات دُنبے ہلاک اور تیئس بکرے اور بکریاں زخمی۔ آج چوہوں نے عالمی امن کا دن منایا اور بلیّوں کے ساتھ پندرہ دن کی دوستی کا معاہدہ کیا۔ باغی مچھلیوں کے ایک گروپ نے دریائے ایمیزن میں ایک مگرمچھ سے بیر رکھا جس کے نتیجے میں پینتالیس مچھلیاں ہلاک اور بے شمار زخمی، آج یو گنڈا میں ہاتھی اور گینڈوں کے درمیان ایک روزہ کرکٹ کا میچ ہار جیت کے بغیر ختم ہو گیا، کینیڈا میں آج بندروں کے لانگ جمپ کے مقابلے ختم ہو گئے۔ جو تین دن سے جاری تھے۔

اور اب خبروں کی تفصیل.....!

آج مالٹا کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا جو گزشتہ آٹھ سال سے ملک پر حکومت کر رہی تھی اور کیلا جو کہ اُس کا مشیر تھا اسے مالٹا کی حکومت ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ گزشتہ آٹھ سالوں سے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا اور وہ ملک کا حکمران بن گیا مالٹے کو خفیہ جیل میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ (تا حکم ثانی)، ویسے عام خیال یہ ہے کہ اُسے پھانسی دی جائے گی کیونکہ مالٹے سے پہلے حکمران یعنی سنگترے کو بھی پھانسی دی گئی تھی۔ اور کیلے نے اب عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے انہیں سبز باغ دکھانے شروع کر دیئے ہیں جو دنیا کی ریت ہے۔

آج دارالحکومت کی جانوروں کی منڈی کے ایک گنجان حصّے میں بم پھٹنے سے سات دُنبے ہلاک اور تیئس بکرے اور بکریاں زخمی ہوئیں۔ باخبر ذرائع کے مطابق سات دُنبوں میں سے ایک دُنبہ آسٹریلیا سے منگایا گیا تھا تاکہ بھارت میں بھی اس نسل کو فروغ حاصل ہو۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ زخمی بکرے اور بکریوں میں سے چار کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ آج وزیر اعظم بھارت زخمیوں کی عیادت کے لئے جائیں گے اور ان کے پس ماندگان کے لئے رقم کا اعلان کریں گے، جو کہ ایک نیک کام ہے۔

آج چوہوں نے عالمی امن کا دن منایا اور بلیّوں کے ساتھ پندرہ دن کی دوستی کا معاہدہ کیا

یاد رہے کہ چوہوں اور بلیوں کے درمیان دشمنی اس کائنات کے وجود پذیر ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس عرصہ میں ان کے درمیان صرف ایک یادوامن کے معاہدے ہوئے جو کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی ختم ہو کر دشمنی میں تبدیل ہو گئے اور اس کے بعد ان کے درمیان کوئی امن کا معاہدہ فروغ نہ پا سکا اور اب دونوں فریقوں کے درمیان کے جو پندرہ دن کی دوستی کا معاہدہ ہوا ہے، وہ خوش آئند بات ہے اور مختلف ممالک نے اس بات کو پرجوش انداز میں سراہا ہے اور معاہدے کی مدت بڑھانے کی پُرزور اپیل کی ہے۔ جس پر چوہے تو راضی ہیں لیکن بلیوں کا موقف ابھی سامنے نہیں آیا۔

دریائے ایمیزن میں باغی مچھلیوں کے ایک گروپ نے ایک مگرمچھ سے بیر رکھا جس کے نتیجے میں پینتالیس مچھلیاں ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئیں۔ ہلاک ہونے والی مچھلیوں میں سے بیشتر مچھلیاں جوان تھیں مگر اس سانحے میں بے شمار گھروں کے یہ چراغ بجھ گئے۔ اور ان کے والدین بے سہارا ہو کر رہ گئے ہیں۔ زخمی ہونے والی مچھلیوں میں سے بیشتر اپنے مختلف اعضاء سے ہاتھ دھو چکی ہیں اور اب وہ کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہیں۔ الغرض اس سانحے میں بے شمار گھروں کے سہارے چھن گئے۔ اس کے نتیجے میں تمام دنیا کی مچھلیوں نے توبہ کر لی کہ اب وہ کبھی بھی مگرمچھ سے بیر نہیں رکھیں گی۔

آج یوگنڈا میں ہاتھیوں اور گینڈوں کے درمیان کرکٹ کا میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہو گیا۔ میچ میں ہاتھیوں نے ٹاس جیت کر اپنی بیٹنگ کا آغاز کیا۔ مقررہ وقت سے پہلے ہاتھیوں نے ایک سو تیس رنز بنائے اور ان کے آٹھ کھلاڑی آؤٹ ہوئے۔ گینڈوں نے شاندار بولنگ کا مظاہرہ کیا کھانے کے وقفے کے بعد گینڈوں نے اپنی بیٹنگ کا آغاز کیا۔ اور انہوں نے جم کر ہاتھیوں کی بولنگ کا مقابلہ کیا لیکن چند نامعلوم وجوہ کی بنا پر میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہو گیا۔ باخبر ذرائع کے مطابق گینڈوں کی ٹیم کا کپتان بہت غصے میں تھا اور اس نے الزام لگایا ہے کہ میچ کے ڈرا ہونے میں ہاتھیوں کا ہاتھ ہے جبکہ ہاتھیوں کی ٹیم کی طرف سے ابھی تک کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔

کینیڈا میں آج بندروں کے لانگ جمپ کے مقابلے ختم ہو گئے جو تین دن سے جاری تھے۔ مجموعی طور پر ان مقابلوں میں براؤن بندروں نے زیادہ انعامات حاصل کئے جبکہ سفید بندروں کا گروپ دوسرے نمبر پر رہا اور کالے بندروں کا گروپ سوئم رہا۔ مونکی آف دی سیریز ٹنکی نامی بندر کو قرار دیا گیا جس کا تعلق براؤن بندروں کے گروپ سے ہے اپنے انٹرویو میں ٹنکی نے کہا ہے کہ میری کامیابیوں میں میرے کوچ کی محنت میری اپنی ہمت اور میرے والدین کی دعاؤں کا ہاتھ ہے۔

فتو پہلوان اور رستم

عبداللہ امیر ——— بہاولپور

فتو پہلوان نے جب رستم پہلوان کی شہرت اور لوگوں سے اس کی تعریف سُنی تو اسے بڑا غصہ آیا۔

"میں اتنا بڑا اور مشہور پہلوان ہوں اور لوگ رستم کی تعریف کر رہے ہیں۔" فتو نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں اس کا مقابلہ ضرور کروں گا۔" یہ سوچ کر وہ رستم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تاکہ اس کا مقابلہ کر سکے آخر کچھ دنوں کے بعد وہ رستم کے گھر جا پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ رستم کے گھر کی دیواریں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں جب فتو دیوار کے پاس پہنچا تو اندر سے کوئی لڑکی اپنی ماں سے کہتی ہوئی سنائی دی۔ "اماں یہ دیکھو! یہ کوڑا کہاں سے آگیا؟"

"جہاں سے بھی آیا ہے اسے اُٹھا کر باہر پھینک دے۔" اماں نے جواب دیا اور تھوڑی ہی دیر بعد فتو کے قدموں میں کوئی چیز آگری اس نے دیکھا تو وہ ایک موٹا تازہ ہاتھی تھا۔ فتو بڑا حیران ہوا مگر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور ہاتھی کو کان سے پکڑ کر دوبارہ گھر کے اندر اُچھال دیا اور زور سے بولا "رستم کہاں ہے؟ میں اُس سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کھیتوں میں کام کر رہا ہے۔ اس سے وہیں مل لو۔" اندر سے رستم کی ماں نے جواب دیا۔ فتو کھیتوں کی طرف چل دیا۔

اس وقت رستم چالیس ٹرالیوں میں دریا کی زرخیز مٹی بھر کر اپنے کھیتوں کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ فتو نے اسے دیکھا تو گرجا "او رستم! اب ٹھہر جا۔ پہلے میرے ساتھ کشتی کر لے۔"

رستم نے ٹرالیاں گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "کشتی تو ہم کریں گے، مگر فیصلہ کون کرے گا؟"

"وہ دیکھو۔" فتو ایک طرف ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "وہ لومڑی جا رہی ہے، اسے پکڑ لو۔"

رستم نے بھاگ کر لومڑی پکڑ لی اور اُسے ٹرالیوں کے ساتھ باندھ دیا۔ ابھی دونوں پہلوانوں نے کشتی لڑنا شروع کی ہی تھی کہ لومڑی ٹرالیوں کو گھسیٹتی ہوئی جنگل میں گم ہو گئی۔

"چلو لومڑی تو بھاگ گئی۔" رستم بولا۔ "اب کسی اور کو تلاش کرو۔"

فتو نے اب ایک چرواہے کی طرف اشارہ کیا۔ چرواہا سومن کا کیکر کندھے پر رکھے اپنی پانچ سو اونٹنیوں کو چرا رہا تھا۔ انھوں نے چرواہے کو بلایا۔ اُس نے اپنی پگڑی اُتاری اور اُس میں اونٹنیوں کو ڈال کر کندھے پر لاد لیا۔ کیوں کہ اُن کے بھاگ جانے کا خطرہ تھا۔

اوپر سے ایک چیل دیکھ رہی تھی کہ چرواہے نے اپنی اونٹنیاں پگڑی میں باندھ لی ہیں تو اُس نے جھپٹا مارا اور اونٹنیاں لے اُڑی۔

اس ملک کی شہزادی چھت پر کھڑی ایک چیل کو دیکھ رہی تھی کہ اتنے میں چیل کے پنجوں میں پکڑی پانچ سو اونٹنیاں شہزادی کی آنکھ میں جا پڑیں۔ شہزادی نے آنکھ کو ملنا شروع کر دیا اور رونے لگی کہ اس کی آنکھ میں کوئی تنکا پڑ گیا ہے۔ ملازموں نے لنگوٹے کسنے شروع کر دیے۔ اور شہزادی کی آنکھ میں گھسنے لگے تاکہ اس تنکے کو باہر نکال لائیں۔

کہنے لگیں ابھی تک تنکا نہیں ملا...!

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

سید مبط شبر زیدی
کراچی

اُردو، ہماری قومی زبان ہے۔ اس سے، ہمیں دلی لگاؤ ہونا چاہیئے۔ دنیا میں کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو اپنی قومی زبان سے محبت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان ہی سے ایک ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۹۱۶ء میں بھارت کے شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و کٹوریہ ہائی اسکول آگرہ اور مشن ہائی اسکول بدایوں میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی، لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور کولمبیا یونیورسٹی میں حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کی وجہ شہرت، اردو کے مشہور نقاد، محقق اور مدیر کی حیثیت سے ہے۔ یہ جامعہ کراچی کے شعبۂ اُردو کے سربراہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان کی تاریخ پر بھی کام کیا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل وہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں دس سال تک پڑھاتے رہے۔ کولمبیا یونیورسٹی میں انھوں نے تحقیقی کام کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سیٹو نامی مشہور بین الاقوامی معاہدے میں شریک ممالک کے لیے مشیر لسانی کی خدمات بھی انجام دیتے رہے ہیں۔

مشہور شعرا مصحفی، جرأت اور نظیر اکبر آبادی پر ڈاکٹر صاحب نے تحقیقاتی کتابیں لکھی ہیں۔ مصحفی پر لکھی گئی کتاب کا نام

"مصحفی، اس کا عہد اور شاعری" ہے۔ جرأت پر لکھی گئی ان کی کتاب کا نام "جرأت اور ان کی عشقیہ شاعری" ہے۔

۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر صاحب جامعہ کراچی سے وابستہ ہوئے۔ اُردو قواعد پر لکھی گئی ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا نام "جامع القواعد" ہے۔ غزل پر ان کی لکھی ہوئی مشہور کتاب "غزل اور متغزلین" ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی آج کل ہمارے ماہنامہ "آنکھ مچولی" کے سرپرست بھی ہیں۔ بفضلِ خدا آپ زندہ ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آپ تا قیامت زندہ رہیں۔

راجہ کا کان گدھے کے ایسا

عمیر عباسی — کراچی

پُرانے زمانے میں ایک راجہ تھا۔ جس کے کان گدھے کے ایسے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے کانوں کو پگڑی کے اندر چھپائے رہتا تھا۔ جب بال کٹوانے کی ضرورت ہوتی تو جو حجام محل کے اندر جاتا، زندہ واپس نہیں آتا تھا۔ اس بات پر لوگ حیران تھے۔ یہاں تک کہ اُس کے مُلک کے سارے حجام قتل کر دیے گئے۔ صرف ایک غریب بیوہ کا اکلوتا کمسن لڑکا بچ رہا تھا، جو لوگوں کے سر کے بال بناتا تھا۔

ایک دن راجہ کے یہاں سے اُس کی بھی طلبی آئی۔ اُس کی ماں ڈر گئی۔ دوڑی دوڑی راجہ کے محل میں گئی اور رو رو کر کہنے لگی "میں غریب، بیوہ عورت ہوں۔ میرا یہی ایک لڑکا ہے۔ راجہ صاحب! رحم کیجیے۔"

راجہ کو رحم آگیا۔ اُس نے اس عورت سے کہا: "میری ایک شرط ہے تم اپنے لڑکے سے کہنا، حجامت کے وقت جو کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے، دوسروں سے بیان نہ کرے، ورنہ میں تم دونوں کو قتل کرا دوں گا۔"

غریب عورت روتی ہوئی گھر واپس آئی اور اپنے بیٹے کو ساری بات سمجھائی۔ لڑکا محل گیا اور وہاں سے بہت اُداس واپس آیا۔ اب وہ چُپ چُپ رہنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ بیمار پڑ گیا۔ اس کی ماں نے دستور کے مطابق اوجھا (طبیب) کو بُلوایا۔ اوجھا نے دیکھ کر کہا: "اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ مگر کسی بھید کو چھپانے سے بیمار پڑ گیا ہے۔" اوجھا لڑکے سے بولا "اچھا، اگر تم اپنا بھید کسی آدمی سے نہیں کہہ سکتے تو جنگل میں جاکے کسی درخت کے سامنے بیان کر دو۔"

لڑکے نے ایسا ہی کیا اور جنگل میں جاکے ایک درخت کے سامنے کہنے لگا: "راجہ کا کان گدھے کے ایسا۔" یہ کہتے ہی وہ لڑکا اچھا ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد راجہ نے اپنا جنم دن منایا۔ طرح طرح کے کھیل تماشے تھے۔ سادھو اور جوگی الگ الگ بیٹھے اپنے "بانم" (ایک قسم کی سارنگی) بجا رہے تھے کہ ایک سادھو کی سارنگی ٹوٹ گئی۔ وہ دوڑا دوڑا اسی جنگل میں گیا، جہاں لڑکے نے افشائے راز کیا تھا۔ سادھو نے اسی درخت کی ایک شاخ کاٹی اور اُس سے دوسرا "بانم" تیار کر لیا۔ جب سادھو واپس آیا تو راجہ نے حکم دیا کہ اب سب جوگی مل کے اپنے اپنے "بانم" بجائیں۔ اس جوگی نے بانم بجانا شروع کیا تو اس میں سے یہ آواز نکلنے لگی: "راجہ کا کان گدھے کے ایسا" سادھو بڑا حیران ہوا اور حیرت اور خوف کے مارے اور زور زور سے اپنا "بانم" بجانے لگا۔ تاکہ وہ آواز دب جائے۔ وہ جتنی تیزی سے "بانم" بجاتا تھا اتنی ہی زور زور سے آواز نکلتی تھی۔ آخر کچھ لوگوں نے راجہ سے کہا: "اس سادھو کی آزمائش کرنی چاہیے۔ آپ اپنی پگڑی اُتاریں۔ اگر بات جھوٹی نکلی تو ہم سادھو کو سزا دیں گے۔" غرض راجہ کی پگڑی اُتاری گئی اور سارا بھید کُھل گیا۔

ہماری مِس

حسن مہدی خراسانی — کراچی

ہمیں اچھی باتیں بتاتی ہیں مِس
بُرائی سے ہم کو بچاتی ہیں مِس
بڑے شان والے ہمارے نبیؐ ہیں
ہمیں اُن کے قصّے سُناتی ہیں مِس
کبھی وقت کو اپنے ضائع نہ کرنا
نصیحت کی باتیں سکھاتی ہیں مِس
حساب ہو، یا انگلش، یا جغرافیہ
بڑی اچھی طرح پڑھاتی ہیں مِس
حسن تم نے دیکھی، ہو شاید یہ بات
خوشی میں بہت گنگناتی ہیں مِس

قلمی دوستی

آؤ ملائیں ہاتھ

ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ گرین گائیڈ ایڈیشن

۱۱۳ ۔ ڈی ۔ نورس روڈ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

آؤ ملائیں ہاتھ

سید امجد گردیزی' ۱۱ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، ریاضی، انگلش، کرکٹر
بننا چاہتے ہیں' وجہ۔ شوق ہے۔
۵۵۵/۸ ۔ سمن آباد ۔ لاہور

محمد اسحاق ۱۷ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
مضمون، اسلامیات، انجینئر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، وطن کی خدمت
محمد اسماعیل جنرل اسٹور۔ جنگ شاہی۔ ضلع ٹھٹھہ (سندھ)

انور خان ، ۱۶ سال
جماعت دہم، تنہا رہنا
مضمون، کیمسٹری، سائنسدان
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، تحقیق سے شوق
مکان نمبر ۲ گلی نمبر ۶۔ راحت آباد۔ ڈاکخانہ پاکستان فارسٹ انسٹی ٹیوٹ پشاور یونیورسٹی پشاور

مکرم رضا' ۱۵ سال
جماعت نہم، قلمی دوستی
مضمون، انگریزی، فوجی افسر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، ملک کا دفاع
۴۲/۲ ۔ جانسن کول بلاکس۔ ریلوے کالونی۔ مغلپورہ لاہور

محمد رضوان ، ۱۵ سال
جماعت نہم، لکھنا پڑھنا
مضمون، بائیالوجی، ریاضی
فوجی بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، ملک کی خدمت
مومن اسکوائر فلیٹ نمبر ۳۰۳ بلاک ۶۔ راشد منہاس روڈ گلشن اقبال کراچی

محمد آصف ، ۱۴ سال
جماعت نہم، اسکاؤٹنگ
مضمون، انگلش، فوجی بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، ملک کی خدمت
مکان نمبر ۲۵۔ گلی نمبر ۸۔ بلاک زیڈ۔ طارق بن زیاد کالونی ساہیوال

محمد زاہد قیوم ۱۶ سال
جماعت دہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، ریاضی، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، لوگوں کی خدمت
مکان نمبر ۲، ۴ گلی نمبر ۳۔ محلہ باغ کالونی۔ رحمانیہ روڈ۔ فیصل آباد

محمد اسلم عومرانی ، ۱۶ سال
جماعت، میٹرک، کرکٹ کھیلنا
مضمون، انگلش، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، غریبوں کی خدمت
معرفت محمد عثمان کریانہ اسٹور۔ کوہی دیلیج۔ ملیر سٹی۔ کراچی نمبر ۲۳

سنتوش کمار ۱۷ سال
جماعت دہم ، خدمت کرنا
مضمون، سائنس، بائیالوجی
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، مریضوں کی خدمت
معرفت چندر لعل چپل اسٹور۔ شاہی بازار۔ پنو عاقل ضلع سکھر

ظفر عباس ، ۱۲ سال
جماعت ششم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، حساب، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، قوم کی خدمت
مکان نمبر ۱۳۔ گلی ۸/۱۔ سردار چپل چوک۔ بلال گنج۔ لاہور

شعبان ندیم ، ۱۳ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، سائنس، پائیلٹ
بننا چاہتے ہیں، وجہ، شوقِ شہادت
معرفت جاوید فوٹو اسٹوڈیو۔ فقیر آباد گیٹ۔ ضلع خیر پور میرس

یامین ۱۴ سال
جماعت نہم ، مطالعہ
مضمون، حیاتیات، ونگ
کمانڈر بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، ملک کی محبت
۳۰۱۔ بلاک ۲۔ ۸۔ شمع پلازہ۔ جی الانہ روڈ۔ کھارادر۔ کراچی

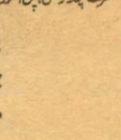

ندیم احمد انصاری ۱۵ سال
جماعت دہم ۔ قلمی دوستی
مضمون کیمسٹری ۔ سرجن بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ وطن کی خدمت
مکان نمبر ۲۹۵ ۔ بلاک سی ۔ لطیف آباد نمبر ۷ ۔ حیدرآباد سندھ

احمد ریحان ۱۴ سال
جماعت ہشتم ۔ ہاکی کھیلنا ، ٹکٹ
جمع کرنا ۔ مضمون ، اسلامیات
انجینئر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوق ہے ۔
۶۰ ۔ ڈی ۔ جی ۔ سیون ۔ تھری بٹو ۔ اسلام آباد

غلام مرتضیٰ ۱۵ سال
جماعت دہم ۔ آنکھ مچولی پڑھنا
کرکٹ کھیلنا ، مضمون کیمسٹری
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ دکھی انسانیت کی خدمت
مکان نمبر ۱۷/۶ ، گلی نمبر ۲ ، الجمہوریہ کالونی ، گاڑی کھاتہ ، حیدرآباد

محمد سعید ۱۵ سال
جماعت دہم ۔ رسائل پڑھنا
کرکٹ کھیلنا ، مضمون اسلامیات
پائیلٹ بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ تاکہ ملک کی سیر کر سکیں
معرفت نذیر احمد رشید احمد کریانہ مرچنٹ ، پاک بازار ، کوٹ رادھا کشن

محمد امان اللہ خان ۱۴ سال
جماعت ہشتم ، رسائل پڑھنا
ٹیکنیکل کام کرنا ۔ انجینئر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ وطن کی خدمت
مکان نمبر ۱۵۰۹/۵ ، آخوند محلہ ، نزد نیشنل بک فاؤنڈیشن ، تانگہ اسٹینڈ ، پرانا سکھر

خالد ریاض ساہی ۱۶ سال
جماعت دہم ۔ جوڈو کراٹے ، قلمی دوستی
مضمون ۔ اسلامیات ، فوجی افسر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ وطن کی حفاظت
مکان نمبر ۴۸/۸ ۔ محلہ بہادر پورہ نزد جامع غوثیہ تحصیل حافظ آباد ۔ گوجرانوالہ

خالد ذکریا ۱۴ سال
جماعت ہشتم ، جاسوسی ناول پڑھنا
مضمون ، سائنس ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوق ہے ۔
فلیٹ نمبر ۹ ، جے پی فلور ، ہانی منزل ، شاہراہ لیاقت ، کراچی

محمد اعجاز خان بابر ۱۳ سال
جماعت ششم ۔ مطالعہ کرنا ،
مضمون ریاضی ، پائیلٹ بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک کی خدمت
کوارٹر نمبر ۳۱۲ ۵ ایل ام سی کالونی ، جامشورو ، تحصیل کوٹری ضلع دادو

حافظ راحیل احمد عباسی ۱۳ سال
جماعت نہم ، مصوری ، لکھنا اور
رسائل پڑھنا ، مضمون انگلش
اسلامیات ، پائیلٹ بننا چاہتے ہیں ، وجہ ، شہادت کا شوق
بلاک نمبر ۳ ۲۶۲ ، کاشانہ اویسی ، نزد پوسٹ آفس محلہ نور شاہ ، احمد پور شرقیہ

محسن ندیم ۱۶ سال
جماعت دہم ، قلمی دوستی
مضمون ۔ انگریزی ۔ ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ غریبوں کی مدد
معرفت تنویر الیکٹرک اینڈ لائٹ سروس ، نزد منی چوک ، جمن آباد فیصل آباد

فہیم قمر شیخ ۱۰ سال
جماعت ششم ۔ پڑھنا
مضمون حساب ، انجینئر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ قوم کی خدمت ۔
ای ۔ ۱۸۰ ، سینٹرل سوسائٹی ، حیدرآباد ، پوسٹ کوڈ نمبر ۷۱۰۰۰

فرحان عبدالحق ۱۲ سال
جماعت ہفتم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون اُردو ۔ پائیلٹ بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوق ہے ۔
مکان نمبر ۲۶ ، شوکت منزل ، رنچھوڑ لائن ، کراچی

محمد اسلم مغل ۱۶ سال
جماعت دہم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون کیمسٹری ۔ ڈی آئی جی
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک کی خدمت
شہر روڈ ۔ ضلع نواب شاہ (سندھ)

مرید خان راز ۱۵ سال
جماعت ہفتم ۔ فٹبال کھیلنا
مضمون اُردو ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ غریبوں کی مدد ۔
گورنمنٹ مڈل اسکول ۔ ڈیرہ اللہ یار ۔ بلوچستان

محمد اختر شیخ ۱۴ سال
جماعت نہم ۔ ہوائی جہازوں کے
بارے میں معلومات ، مضمون حساب
ایئر مارشل بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ وطن کا دفاع ۔
مکان نمبر ۳۶۴ ، بلاک ۶ ، یونٹ نمبر ۸ ، لطیف آباد ، حیدرآباد

کاشف غنی ۱۳ سال
جماعت ششم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون حساب ، سائنسدان
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ وطن کی خدمت
۴ - ۲۳/ R ۔ ۵۸۷ ، کورنگی ، کراچی نمبر ۲

محمد اقبال ۱۶ سال
جماعت دہم ۔ فٹبال کھیلنا
آنکھ مچولی پڑھنا ، مضمون بائیلوجی
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک و قوم کی خدمت
گورنمنٹ مڈل اسکول ڈیرہ اللہ یار ، ضلع جعفر آباد ۔ بلوچستان

غلام عباس ۱۱ سال
جماعت پنجم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون ، معاشرتی علوم ۔ پروفیسر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ بہت پسند ہے ۔
نزد پولیس اسٹیشن دار برجی ، تحصیل ننکانہ صاحب ، ضلع شیخوپورہ

وسیم عباس ۱۴ سال
جماعت ہفتم، کہانیاں لکھنا
مضمون اُردو۔ مصنّف
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ کہانیاں لکھنا پسند ہے
معرفت شیخ غلام عباس۔ مینجر باٹا شوز اسٹور کینٹ II۔ سیالکوٹ کینٹ

ذیشان احمد ۱۲ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، ڈرائنگ۔ جج یا
وکیل بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ شوق ہے۔
احمد الیکٹرک اسٹور۔ تحصیل بازار۔ بہاد نگر

مہر دین ۱۶ سال
جماعت دہم، ناول پڑھنا
مضمون، انگلش۔ فوجی کمانڈر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کی حفاظت
محلّہ بدنگر۔ ڈیرہ اسماعیل خان

عمران بدر ۱۱ سال
جماعت ششم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، سائنس۔ ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کی خدمت
معرفت اللہ رکھی پرچون فروش۔ گارڈن تھانہ۔ کراچی ۳

محمد الیاس بھایا ۱۵ سال
جماعت دہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، انگلش، بینک منیجر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ غریبوں کی مدد
مکان نمبر ۶۵-E۔ بندھانی محلّہ نمبر ۶۔ بھیا چاند گاڑی کوٹھے۔

نجف سرور ۱۵ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
مضمون، حساب، کمپیوٹر
انجینئر بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ خواہش ہے۔
مکان نمبر ۱۰۔ گلی نمبر ۲۹۔ برنی روڈ۔ گڑھی شاہو۔ لاہور

کاشف شرافت ۱۸ سال
جماعت دہم، کہانیاں پڑھنا
مضمون، ریاضی۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک و قوم کی خدمت
۲۳/۳۔ لیاقت آباد۔ کراچی

شکیل احمد ۱۶ سال
جماعت دہم۔ رسائل پڑھنا
مضمون۔ اسلامیات۔ ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ دُکھی انسانیت کی خدمت
معرفت اویس کلینک ڈاکٹر شیراز۔ محمد ایوب کالونی۔ گلی ۶ فیصل آباد

محمد رمضان راجپوت ۱۵ سال
جماعت نہم۔ قلمی دوستی
اور رسالے پڑھنا۔ مضمون انگلش
پائیلٹ بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کی خدمت
گورنمنٹ ہائی اسکول۔ کوٹ غلام محمد۔ سندھ

نندلال بنڑ ۱۶ سال
جماعت فرسٹ ایئر، کہانیاں
سُننا اور لکھنا۔ مضمون سائنس
سرجن بننا چاہتے ہیں وجہ۔ غریبوں کی خدمت
مالک مل آئل۔ مل کریانہ مرچنٹ۔ شاہی بازار۔ گھوٹکی

سید عمران حیدر ۱۳½ سال
جماعت ہشتم۔ رسائل پڑھنا
مضمون۔ ریاضی۔ پائیلٹ
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کی خدمت
بمقام کینتربلی۔ ڈاکخانہ کالا گجراں۔ تحصیل و ضلع جہلم

محمد ندیم اختر ۱۵ سال
جماعت نہم۔ قلمی دوستی
مضمون انگلش۔ آرمی آفیسر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کی حفاظت
معرفت القیوم آٹو اسٹور۔ تونسہ شریف۔ ضلع ڈیرہ غازی خان

- قلمی دوستی کے اِس کالم میں صرف اسکول کے طلب شریک ہو سکتے ہیں۔
- کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا۔
- خراب اور نامکمّل کوپن قابل قبول نہ ہوں گے۔

نام ــــــــــــ عمر ــــــــ جماعت ــــــــ
مشاغل ــــــــــــ اسکول میں پسندیدہ مضمون ــــــــ
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ھیں۔ ــــــــ وجہ ــــــــ
پتہ ــــــــــــــــــــــــ

امّی ابّو کا صفحہ

اُمِّ رُمیصاء

بچّوں کی گمشدگی سے متعلق اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات یا خبریں آپ کی نظر سے یقیناً گزرتی ہوں گی۔ بچّوں کی گمشدگی کے اسباب کا جائزہ لیں تو عام طور پر تین اسباب سامنے آتے ہیں۔ (۱) نسبتاً کم عمر کے بچّے کسی بھیڑ بھاڑ میں اپنے والدین سے بچھڑ جاتے ہیں اور محض گھر کا پتہ یا والدین کا نام یاد نہ ہونے کی وجہ سے بآسانی گھر واپس نہیں آپاتے۔ (۲) بچّے اغوا کر کے بیگار کیمپ پہنچا دیے جاتے ہیں۔ یا بعض صورتوں میں جرائم پیشہ لوگ بھاری رقوم یا تاوان حاصل کرنے کے لیے بچّوں کو اغوا کرتے ہیں۔ (۳) بچّے گھروں سے بھاگ جاتے ہیں۔ اور اس وقت تک واپس نہیں آتے جب تک گھر سے باہر پیش آنے والی تکالیف انھیں گھر کی راحت کا احساس نہیں دلاتیں۔

آپ غور کیجیے۔۔۔ گمشدگی کی ان تینوں صورتوں کا باعث کہیں والدین کی غفلت یا لاپرواہی تو نہیں؟ یقیناً ایسا ہے۔۔۔ لاپتہ ہونے والے بچّوں میں بہت کم تعداد ایسے بچّوں کی ہوتی ہے جو اپنی یا اپنے والدین کی غفلت سے نہیں بلکہ محض اتفاق یا بدقسمتی سے لاپتہ ہوتے ہیں۔ ورنہ اکثر بچّے اپنے بڑوں کی بے توجہی یا غیر ذمّہ داری کی وجہ سے کھو جاتے ہیں۔

درج ذیل ہدایات کو بغور پڑھیے۔۔۔ اور سوچیے کہ کہاں آپ سے کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ اگر آپ نے ان ہدایات کو بغور پڑھا اور ان پر عمل کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے بچّے کی گمشدگی کا امکان یقینی طور پر ختم یا بڑی حد تک کم ہو جائے۔

I۔ اپنے کم عمر بچّے کو اپنا نام، گھر کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر ضرور یاد کروا دیجیے؟ تاکہ خدانخواستہ کہیں کھو جانے کی صورت میں وہ نام و پتہ بتا کر گھر واپس آجائے۔ II گھر لوٹتے ہوئے اگر چھوٹے بچّے آپ کے ساتھ ہیں تو اُن سے کہیے کہ وہ گھر تک آپ کی رہنمائی کریں تاکہ آپ کو یہ تسلی ہو جائے کہ بچّے کو گھر کا راستہ یاد ہے۔

۲۔ اپنے بچّوں کو یہ بات ذہن نشین کروا دیں کہ وہ راہ چلتے کسی اجنبی سے کوئی چیز لے کر نہ کھائیں۔ کسی کے بلانے پر بغیر سوچے سمجھے اس کی طرف نہ جائیں۔ اور نہ ہی کسی کے پتہ پوچھنے پر جھٹ اُس کی گاڑی میں سوار ہو کر اُس کے رہنما بننے کی کوشش کریں خواہ وہ بچّوں کے والدین سے کتنی ہی دوستی کا دعویدار کیوں نہ ہو۔ اسی طرح بچّوں کو لفٹ لے کر سفر کرنے کی عادت سے بھی باز رکھیں۔

۳۔ اپنے بچّوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت پر غور کریں کہ آیا ان کی نوعیت خوشگوار بھی ہے یا نہیں۔ اپنے بچّوں کے اچھے دوست اور شفیق بزرگ بنیئے۔ اپنے رویّوں کو نرم رکھیے اور ان کی جائز خواہشات کا خیال رکھیے۔ نیز اُن کے حلقۂ دوستی اور ان کی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھیے۔۔۔ بُرے دوست بھی ورغلانے کا باعث ہو سکتے ہیں۔

یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی سی باتیں، آپ کو اُس بڑی اُفتاد سے بچا سکتی ہیں جو بچّے کی لاپتہ ہونے کی صورت میں اچانک آپ پر آپڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بچّوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

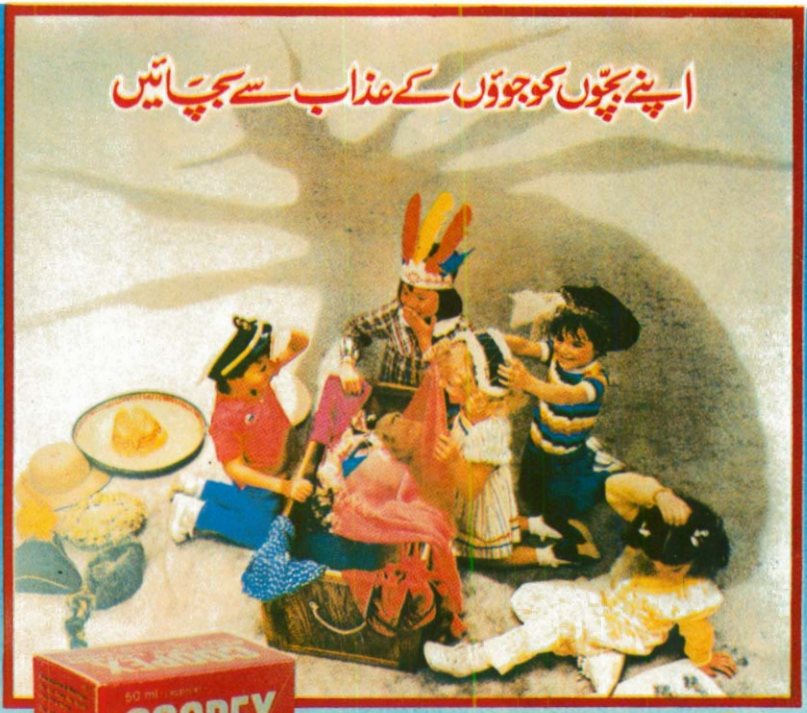

اپنے بچّوں کو جوؤں کے عذاب سے بچائیں
50 ml
COOPEX
ANTI LICE LOTION
FOR SAFE AND EFFECTIVE TREATMENT OF HEAD LICE
کوپیکس
اینٹی لائس لوشن
استعمال کریں
کوپیکس اینٹی لائس لوشن بچوں کی جلد اور بالوں کو نقصان نہیں پہنچاتی۔
کوپیکس ڈی ڈی ٹی، بی ایچ سی، پروپوکسر، میلاتھیان اور اسی قسم کے
دوسرے مضر صحت اجزاء سے پاک ہے۔
قیمت صرف
15.50
جوؤں اور لیکھوں سے موثر نجات کیلئے کوپیکس اینٹی لائس لوشن
TRANSWORLD

REGD. No. M-266 SEPTEMBER 1988

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI